بسم اللہ الرحمن الرحیم

پندرہ روزہ تعمیرِ حیات لکھنؤ

ISSN 2582-4619

جلد نمبر ۶۱ | ۱۰؍فروری ۲۰۲۴ء مطابق ۲۸؍رجب المرجب ۱۴۴۵ھ | شمارہ نمبر ۷

اس شمارے میں

شعروادب ہم ہیں مسلماں الحمدللہ	مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ	۴
اداریہ حکیم وعادل ذات کا غضب	شمس الحق ندوی	۵
ایمانِ کامل دینی تعلیم وتربیت اور والدین کی ذمہ داری	حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ	۷
فکرونظر عقل واعتدال میں سلامتی کا راستہ	مولانا عبدالماجد دریابادیؒ	۱۰
آداب زندگی اسلامی نمونہ پیش کرنے کی ضرورت	مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	۱۲
دینِ رحمت خالقِ کائنات کا نازل کردہ نظام	مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی	۱۴
سخن دلپذیر حقیقت پسندی اور خوش تدبیری	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۱۶
بحث ونظر ملت کی زبوں حالی اور اسبابِ زوال......	مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری	۱۹
تحفۂ ربانی سفرِ معراج کا پیغام	ڈاکٹر سراج الدین ندوی	۲۱
ادبِ اسلامی 'قصص الانبیاءٔ' کا بچوں کے ادب......	محمود حسن حسنی ندویؒ	۲۳
رفتارِ زمانہ بٹ کوائن میں مصنوعی قیمت......	ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی	۲۵
رسید کتب تعارف وتبصرہ	محمد اصطفاء الحسن ندوی	۲۸
عہد ساز شخصیت حضرت مفکر اسلامؒ۔ عظیم مفکر وقائد	محمد کلام الدین ندوی	۳۰
فقہ وفتاویٰ سوال وجواب	مفتی محمد ظفر عالم ندوی	۳۳

سرپرست

حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

(ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

مدیر مسئول

شمس الحق ندوی

نائب مدیر

محمد عمیر الصدیق دریابادی ندوی

معاون مدیر

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی ❀ محمد جاوید اختر ندوی

مجلس مشاورت

مولانا عبدالعزیز بھٹکلی ندوی ❀ مولانا محمد خالد غازی پوری ندوی

قارئین محترم! تعمیرِ حیات کا سالانہ زرِتعاون ذیل میں دیے گئے اکاؤنٹ میں جمع کرائیں!

TAMEER E HAYAT

A/c. No. 10863759868 (Current A/c.)

IFSC Code : SBIN0000125 -- Swift Code : SBINNB157

State Bank of India, Main Branch, Lucknow

براہِ کرم رقم جمع ہوجانے کے بعد دفتر کے فون نمبر یا ایمیل پر خریداری نمبر کے ساتھ اطلاع ضرور دیدیں۔

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

TAMEER–E–HAYAT

Tagore Marg, Badshah Bagh, Lucknow - 226007, Ph.:0522-2740406

website : http://tameerehayat.com - email : tameer1963@gmail.com

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

سالانہ زرتعاون -/400	فی شمارہ -/20	ایشیائی، یورپی، افریقی وامریکی ممالک کے لئے۔ 75$

ڈرافٹ منیجر تعمیر حیات کے نام سے بنائیں اور دفتر تعمیر حیات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پتہ پر روانہ کریں۔ چیک سے بھیجی جانے والی رقم صرف All CBS Payable Multicity Cheques روانہ فرمائیں، بصورت دیگر ₹30/= جوڑ کر چیک دیں۔ براہ کرم اس کا خیال رکھیں۔

آپ کی خریداری نمبر کے نیچے اگر سرخ لکیر ہے تو سمجھیں کہ آپ کا زرتعاون ختم ہوچکا ہے، لہٰذا جلد ہی زرتعاون ارسال کریں۔ اور منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں، موبائل یا فون نمبر اور پتے کے ساتھ پن کوڈ بھی لکھیں۔ (منیجر تعمیر حیات)

پرنٹر پبلشر محمد طٰہٰ اطہر نے آزاد پرنٹنگ پریس، نظیر آباد، لکھنؤ سے طبع کراکے دفتر تعمیر حیات مجلس صحافت ونشریات ٹیگور مارگ، بادشاہ باغ لکھنؤ سے شائع کیا۔

شعر وادب

ہم ہیں مسلماں الحمدللہ

مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ

ہم ہیں مسلماں الحمد للہ
ہم اہلِ ایماں الحمد للہ
ہم اہلِ قرآں الحمد للہ
ہم اہلِ عرفاں الحمد للہ

ہے رب ہمارا صرف ایک اللہ
زیبا اس کو ہے حشمت و جاہ
الملک للہ، الحکم للہ
اس کی حکومت ہر لحظہ ہر گاہ

حضرت محمدؐ سچے پیمبر
سب سے مکرم، سب سے مؤقر
سب کچھ ہمارا ان پر نچھاور
رحمت خدا کی ہر لمحہ اُن پر

ہم حاملانِ شرعِ متیں ہیں
ہم اہلِ دل ہیں، اہلِ یقیں ہیں
پاکیزہ رو ہیں، روشن جبیں ہیں
ہم صاحبانِ دنیا و دیں ہیں

قلب و نظر کے ہم ہیں حجازی
زاہد مجاہد، غازی نمازی
رومی غزالی، شبلی و رازی
شیوہ ہمارا ہے پاکبازی

رہبر ہمارا عشقِ بلالی
عزمِ مجدد، روحِ غزالی
مقصد مبارک، منزل ہے عالی
اللہ مالک اللہ والی

ہم ظالموں سے ڈرتے نہیں ہیں
ان کا کبھی دم بھرتے نہیں ہیں
عیش و طرب پر مرتے نہیں ہیں
باطل کی عزت کرتے نہیں ہیں

ہم ہیں مسلماں الحمد للہ
الحمد للہ الحمد للہ

☆☆☆☆☆

اداریہ

حکیم وعادل ذات کا غضب وناپسندیدگی

شمس الحق ندوی

اس وقت مسلمان جن رسوا کن حالات سے دوچار ہیں، ان میں دخل دوسری بہت سی اخلاقی، سماجی خرابیوں کے ساتھ اس کا بھی ہے کہ وہ اپنے ذاتی معاملات اور اپنی دلچسپی کے دائرہ میں اسراف وفضول خرچی، شہرت وعزت کے حصول یا رسم ورواج کی پابندی میں تو بے دریغ روپئے خرچ کرتے ہیں؛ لیکن عزیزوں، پڑوسیوں اور ملت کے دوسرے افراد کے فقروفاقہ اور ان کے قابل رحم حالات کی طرف نگاہ تک نہیں اٹھاتے، ایسے حالات میں جبکہ امت کے بے شمار لوگ بھوک پیاس کی بھٹی میں جل رہے ہوں، بیمار ہوں، دوا علاج کے لیے پیسے نہ ہوں، ان کے پاس تن ڈھکنے کے لیے لباس تک نہ ہو، محض اپنی ناموری اور شہرت کی خاطر تقریبات میں پانی کی طرح روپے بہانا رزق دینے والے مالک وکارساز عالم کو کیسے پسند آسکتا ہے؟ اس لیے دیکھنے میں آتا ہے کہ ان سب باتوں کی نحوست کے سبب مختلف شکلوں میں جانی مالی نقصان ہوتا ہے، مگر ادھر خیال تک نہیں جاتا۔

حیرت ہوتی ہے کہ بہت سے دیندار حضرات کے یہاں بھی علاوہ دیگر رسمیات وفضول خرچی کے صرف پٹاخوں میں دس بیس پچاس ہزار خرچ ہوجاتا ہے، اس میں ذرا شبہ نہیں کہ یہ صورت حال اللہ تعالیٰ کی حکیم وعادل ذات اور ربوبیت ورحمت عامہ کی صفات کے لیے غضب اور سخت ناپسندیدگی کا باعث ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر مال کی زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ امت کے ان ضرورتمندوں کی ضرورتیں پوری ہوں اور مال والوں میں شہرت وناموری کے بجائے غرباء پروری کا شوق وجذبہ پیدا ہو جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا باعث ہوتا ہے، اس سے معاشرہ کی دوسری بہت سی خرابیاں دور ہوتی ہیں، زکوٰۃ نہ دینے کے سبب مختلف صورتوں میں مالی وجانی نقصان ہوتا رہتا ہے؛ لیکن اس پر بالکل غور نہیں کیا جاتا۔

ملت کے مالدار اور باحیثیت حضرات ملی تقاضوں اور ضرورتوں سے نگاہیں پھیر کر اپنی ذاتی خواہشات اور حوصلہ مندیوں پر تو بے دریغ اور شاہانہ اولوالعزمیوں کے ساتھ روپے خرچ کریں؛ لیکن ملت کے بقاء کے لیے کام کرنے والے ادارے اور تحریکیں وسائل کی کمی کی وجہ سے مشکل ترین اور دشوار صورتحال سے دوچار ہوں، تو پھر یہ مالدار لوگ چاہے قارون وقت ہوں، ہر وقت خطرہ میں ہیں، مال دینے والے کی نگاہ میں ان کی ایک تنکے کے برابر بھی حیثیت نہیں، حالات کی معمولی سی تبدیلی اور واقعات کی کوئی ہلکی سی لہر بھی ان کے سارے سہاروں کو ریت کی دیوار کی طرح بہا کر لے جائے گی اور ایک خدا فراموش اور عیش وعشرت کی زندگی گذارنے والی قوم کی طرح ان کا حال بھی یہی ہوگا جس کی تصویر کشی قرآن پاک نے اس طرح کی ہے:

”فَاَتٰهُمُ اللّٰهُ مِنۡ حَيۡثُ لَمۡ يَحۡتَسِبُوۡا وَقَذَفَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمُ الرُّعۡبَ“ [سورة حشر:۲] (تو ان پر آیا اللہ تعالیٰ کا عذاب ایسی جگہ سے کہ ان کو گمان بھی نہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے ڈال دیا ان کے دلوں میں رعب)۔

جس فضا وماحول میں ملت کا وجود اور اس کا مستقبل خطرہ میں ہو، اس کی آنے والی نسل کو اس کے دین وعقیدہ سے محروم کردینے کی کوششیں مختلف منصوبوں کی صورت میں ہو رہی ہوں، اس ماحول میں ملت کی آنے والی نسلوں کی تعلیم وتربیت کی فکر کے بجائے ملت کے سرمایہ داروں کی بڑی تعداد اسراف وفضول خرچی میں مبتلا ہو اور شہرت کی خاطر فخر کے طور پر تقریبات میں بے تحاشہ روپے خرچ ہوں، یہ اللہ

تعالیٰ کو کیسے پسند آسکتا ہے اور کتنی مدت تک چھوٹ مل سکتی ہے؟

امت مسلمہ کی یہ خصوصیت رہی ہے، جو کسی دوسرے دین و مذہب میں نہیں پائی جاتی کہ علماء ایسی باتوں پر برابر تنقید کرتے اور امت کو ہوشیار کرتے رہے ہیں اور امت کے ایسے افراد نے اس کو سنا اور مانا ہے جس سے امت کا بھرم قائم رہا ہے۔

اندلس کے خلفیہ عبدالرحمٰن الثالث نے جب مدینۃ الزہراء تعمیر کیا تو اپنی خاص نشست گاہ کے گنبد میں سونے چاندی کی اینٹیں لگوائی تھیں؛ لیکن جب قاضی منذرؒ نے قرطبہ کی جامع مسجد میں بھرے مجمع میں خلیفہ کے اس کام میں تنقید کی تو خلفیہ نے اس گنبد کو گرادیا اور دوبارہ اس کو عام اینٹوں سے تعمیر کروایا، امت کے ان حالات پر تنقید نے اس کو فائدہ پہنچایا ہے، سنبھالہ دیا ہے، اس سے قوم میں زندگی اور بیداری پیدا ہوتی ہے، ایک عربی شاعر کہتا ہے:

وفی العتاب حیاۃ بین أقوام

(قوم پر بے لاگ تنقید قوم کو زندگی کی نئی قسط عطا کرتی ہے)

یہی وجہ ہے کہ بے جا اور بے تحاشا خرچ کرنے کی قرآن کریم میں سخت ممانعت اور مذمت آئی ہے، ارشاد ربانی ہے: ”وَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيراً، إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُوراً“. [سورۃ اسراء:۲۵] (اور رشتہ داروں محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو، فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ کہ فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار (کی نعمتوں) کا کفران کرنے والا (یعنی ناشکرا) ہے)۔

اس کے برخلاف صحیح طریقہ پر مال خرچ کرنے کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کی تعریف اس طرح کرتا ہے:

”وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَاماً“ [سورۃ الفرقان:۶۷] (اور جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بیجا اڑاتے ہیں اور نہ وہ تنگی کو کام میں لاتے ہیں، بلکہ اعتدال کے ساتھ خرچ کرتے ہیں، ضرورت سے زیادہ نہ کم)۔

اس وقت ایک مثالی واقعہ پر اپنی بات ختم کرتا ہوں جو شاید دلوں میں جھرجھری پیدا کردے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ماہر نباتیات ڈاکٹر ابرار مصطفیٰ مرحوم کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے بڑی عقیدت ومحبت تھی، بیعت کا شرف بھی حاصل تھا، مرحوم گھر کے بھی بڑے صاحب جائیداد تھے، انہوں نے اپنی لڑکی کی شادی میں حضرت مولاناؒ کو علیگڑھ آنے کی دعوت دی، حضرت اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود تشریف لے گئے، وہ حضرت کی آمد پر اتنا خوش ہوئے، کہا کہ: اگر وزیر اعظم بھی ہمارے یہاں آتے تو اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی آپ کے آنے سے ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب نے نہایت سادگی کے ساتھ بیٹی کی شادی کردی، جہاں تک یاد پڑتا ہے کچھ رقم بیٹی کے نام بینک میں جمع کردی اور ایک دینی ادارہ میں ایک کمرہ بھی صدقہ جاریہ کے طور پر تعمیر کروادیا۔

اس انداز کو اعزہ اور خاندان والوں نے بڑا توہین آمیز عمل محسوس کیا اور کہا کہ تمہارے پاس اگر نہیں تھا تو ہمیں بتاتے، ہم سب مل کر اس کا انتظام کردیتے، تم نے تو ہماری ناک کٹادی، اس پر ڈاکٹر صاحب مرحوم نے کہا کہ ہاں! ناک بہت بڑھ گئی تھی، اس لیے اس کا کٹوانا ضروری ہوگیا تھا۔

اللہ رب العزت ہم سب کو اپنی مرضیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق دے، آمین۔

☆☆☆☆☆

ایمان کامل

دینی تعلیم وتربیت اور والدین کی ذمہ داری

انجمن تعلیمات دین ضلع گورکھپور کے زیر اہتمام ۳۰ر اکتوبر ۱۹۸۳ء کو اسلامیہ کالج میں کی گئی تقریر

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

"یَا أَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوا قُوا أَنْفُسَکُمْ وَأَھْلِیکُمْ نَاراً وَقُودُھَا النَّاسُ وَالْحِجَارَۃُ عَلَیْھَا مَلَائِکَۃٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا یَعْصُونَ اللّٰہَ مَا أَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُونَ مَا یُؤْمَرُونَ". [سورۃ التحریم:۶] (اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو ایسی آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں اور جس پر تندخو اور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جس کا ان کو حکم دیا جاتا ہے وہ بجالاتے ہیں)۔

میں نے آپ کے سامنے قرآن شریف کی ایک آیت پڑھی ہے جو اس سے پہلے بارہا آپ کے سامنے پڑھی گئی ہوگی اور قرآن شریف کی تلاوت میں آپ کی نظر سے گزری ہوگی، لیکن ضروری نہیں ہے کہ جو چیز بار بار نظر کے سامنے آئے، اس پر آدمی غور بھی کرے، آپ سڑکوں پر سے گزرتے ہیں، سائن بورڈ برسوں سے لگے ہوئے ہیں، آپ کی نظر بھی پڑتی ہے، لیکن آپ خود سوچئے کہ آپ نے کتنی بار غور سے پڑھا اور آپ کو یاد رہا، اگر آپ سے پوچھا جائے کہ آپ جس سڑک سے گزر کر آئے ہیں اس میں اہم اہم سائن بورڈ کس چیز کے ہیں تو کم لوگ بتاسکیں گے۔

آیت بڑی چونکا دینے والی ہے اور ایسی ہے کہ اگر اس کا خطرہ نہ ہو کہ بار بار جو چیز سامنے آتی ہے اس پر سے توجہ ہٹ جاتی ہے وہ روزمرہ کی چیزوں میں سے سمجھی جانے لگتی ہے، تو میں عرض کرتا اور اصرار کرتا کہ یہ آیت جلی حروف سے لکھوا کر دیواروں پر لگوادی جائے، مسجدوں میں بھی آویزاں کردی جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے وہ لوگو جو خود ایمان لاچکے ہو "یا ایھا الذین آمنوا" یہ "آمنوا" ماضی کا صیغہ ہے ہر لفظ پر غور کیجیے، قرآن مجید کا کوئی لفظ اتفاقی یا بھرتی کا نہیں ہوتا، یہ کوئی شاعری نہیں "أیھا المومنون" کہا جاسکتا تھا "أیھا المسلمون" کہا جاسکتا تھا، اے مسلمانو! اے جماعت مومنین! لیکن فرمایا "یا أیھا الذین آمنوا" اے وہ لوگو! جو خود ایمان لاچکے ہو "قوا أنفسکم وأھلیکم ناراً وقودھا الناس والحجارہ" (بچاؤ اپنی جانوں کو اپنے گھر والوں کو، اپنے متعلقین کو، اپنے ماتحتوں کو آگ سے جس کا ایندھن ہے آدمی اور پتھر) اس آیت کے مخاطب مسلمان تھے، وہ صحابہ تھے جو قرآن مجید کے نزول کے وقت موجود تھے، وہ اولین مخاطب تھے، یوں قیامت تک کی تمام مسلمان نسلیں اور جو بھی پیدا ہوا اور اپنے کو مسلمان کہے وہ سب مخاطب ہیں، لیکن پہلے مخاطب اس کے وہ لوگ تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ایمان لاچکے تھے، آپ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا تھا، جن کو شرف صحابیت حاصل تھا، اور اس میں یقیناً وہ لوگ بھی تھے جو بیعت رضوان میں شریک رہے ہوں گے، جنہوں نے حدیبیہ میں درخت کے نیچے جان دینے پر بیعت کی تھی، جن کے متعلق ارشاد ہے: "لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِینَ إِذْ یُبَایِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِی قُلُوبِھِمْ فَأَنْزَلَ السَّکِینَۃَ عَلَیْھِمْ وَأَثَابَھُمْ فَتْحاً قَرِیباً" [سورۃ الفتح:۱۸] (اے پیغمبر) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کررہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا، اور جو (صدق وخلوص) ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کرلیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی)۔

جن کو یہ انعام ملا تھا اور جن کو قیامت تک کے لیے سند دی گئی ہے کہ اللہ ان سے راضی ہوا، ایسے سند یافتہ اور بلند مرتبہ لوگ بھی اس آیت کے مخاطب ہیں جو بیعت رضوان میں شریک ہوئے تھے، اور عشرہ مبشرہ بھی اس میں یقیناً شامل ہیں، اور کبار صحابہ بھی اس میں شامل ہیں، اور بدر اور احد کے "زندہ شہید" بھی مخاطب ہیں۔

اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا کوئی آدمی جان بوجھ کر اپنے لڑکوں کو اپنے گھر والوں کو آگ میں جھونکتا ہے، آگ میں گھسنے دیتا ہے؟ اس کا کیا مطلب کہ اللہ کہتا ہے کہ: اے وہ لوگو! جو خود ایمان لاچکے ہو، اب تمہارا کام یہ ہے کہ اپنی جانوں کو بچاؤ، اپنے گھر والوں کو بچاؤ، دوزخ کی آگ سے، کیا کوئی واقعہ آپ نے سیرت میں ایسا پڑھا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے (معاذ اللہ) ارادہ کیا تھا کہ اپنے بچوں کو آگ کے حوالہ کردیں، یا بچے آگ میں کودنا چاہتے تھے اور صحابہ کرامؓ اور اس وقت کے مسلمان خاموش بیٹھے ہوئے تماشا دیکھ رہے تھے اور اس صورت حال پر راضی تھے، کیا ایسا کوئی واقعہ آپ کی نظر سے گزرا ہے؟ تو کیا بے ضرورت یہ بات کہی گئی ہے کہ اے وہ لوگو جو خود

ایمان لاچکے ہوتمہارا کام یہ ہے کہ اپنی جانوں کو، اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ، یہ کون سی آگ تھی، اور کب یہ واقعہ پیش آیا تھا، یا پیش آنے والا تھا کہ مسلمانوں کے گھروں کے بچے آگ میں کودنا چاہتے تھے، اور ماں باپ سو رہے تھے فکر نہیں کر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس وقت وحی نازل کی، سب چونک گئے اور سب اپنے بچوں کی فکر میں لگ گئے کہ آگ میں چھلانگ نہ لگائیں، پھر اس آیت کا مطلب کیا ہے؟

کیا اس آیت کا مطلب اس کے سوا کچھ اور ہوسکتا ہے کہ اپنے بچوں کو اپنے گھر والوں کو ایسی چیزوں سے بچاؤ جو آگ تک لے جانے والی ہیں، جن کا انجام یہ ہونے والا ہے کہ دوزخ میں جائیں، ورنہ کون سے انسان ہیں جو اپنے بچوں کو آگ کی طرف جاتے ہوئے دیکھیں اور ان کو روک نہ لیں؟ خطرہ صرف اس بات کا ہے کہ آدمی یہ نہ جانتا ہو کہ اس کے نتیجے میں جلنا ہوتا ہے، تو مطلب یہ ہوا کہ ایسے اسباب سے بچاؤ جو دوزخ کی آگ تک پہونچانے والے ہیں، اس کو فقہ کی زبان میں "أسباب مؤدیہ" کہتے ہیں، یعنی وہ اسباب جو کسی نتیجہ تک پہونچانے والے ہوں، فقہاء کے نزدیک وہ بھی نتائج کے حکم میں داخل ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو ایسی دوا دے رہا ہے جس کے نتیجہ میں موت ہوتی ہے، چاہے وہ دیر سے ہو، یہ عمل قتل ہی کے مرادف ہے، اس لیے کہ اس نے وہ سبب اختیار کیا، جس کے نتیجہ میں موت کا آنا یقینی ہے، تو قانون بھی اس کو قاتل کہے گا، حکیم صاحبان ڈاکٹر صاحبان، بھی اس کو قاتل ہی سمجھیں گے، یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ ایسی چیزوں سے بچاؤ جو آگ تک پہونچا دینے والی ہیں۔

اب میں آپ سے عرض کرتا ہوں کہ صورت حال اس وقت یہی ہے بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام نہ کرنا بچوں کو اس ماحول کے بالکل حوالہ کر دینا اور ان کو اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا جو اس بات کا نہ مکلّف ہے، نہ اس بات کا مدعی، نہ اس بات کا اہل کہ وہ بچوں کو وہ تعلیم دے گا، جس پر نجات موقوف ہے، پیغمبروں کی لائی ہوئی وہ تعلیم جس سے ناواقفیت کے نتیجہ میں ایمان کا خطرہ ہے، آخرت کی ہلاکت ہے، تو اب یہ دیکھنا چاہئے کہ اس بات کو بچے کے لیے کیسے گوارا کیا جارہا ہے؟ موجودہ تعلیمی نظام صرف لادینی (Secular) نہیں، وہ ایک مثبت ومعین نظام تعلیم (Positive System of Education) ہے، ہندو دیومالا (Hindu Mythology) اس میں شامل ہے، انگریزوں کے زمانہ میں تعلیم سیکولر تھی، بلی کتے کے قصے ہوتے تھے، اور ہم میں سے بہت سے لوگوں نے انگریزوں کے عہد حکومت میں انگریزی پڑھی ہے اس وقت زبان سکھانے والی ابتدائی کتابوں سے نہ کسی کے عقیدہ پر اثر پڑتا تھا، نہ کسی مخلوق کا تقدس پیدا ہوتا تھا اور نہ اس کائنات میں کسی مخلوق کا تصرف واختیار معلوم ہوتا تھا، اس وقت بھیڑیئے، چیتے، بندر اور لومڑی اور بلی کتے کے قصے بچے پڑھتے تھے، ویسے کے ویسے ہی گھر آتے تھے جیسے جاتے تھے، لیکن اب صورت حال یہ نہیں ہے، سرکاری نصابی کتابوں میں عقیدہ پر اثر ڈالنے والے اسباق، قصے کہانیاں اور مضامین ہوتے ہیں، اور جو کسر کتابوں میں رہ جاتی ہے وہ ماسٹر صاحبان پوری کرتے ہیں، بچوں کو کچھ اجتماعی کام ایسے کرنے پڑتے ہیں جو اسلام کے عقیدۂ توحید کے منافی ہیں۔

میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ ڈھلوان راستہ ہو، جس پر پاؤں بھی نہ جمتے ہوں، اس پر کوئی بچہ سائیکل پر بیٹھا ہوا جارہا ہو، آگے کھائی ہو، سائیکل کا بریک بھی ٹھیک کام نہ کرتا ہو، باپ دیکھ رہا ہے کہ بچہ سائیکل پر بیٹھا ہے اور اس سے بھی واقف ہے کہ بریک نہیں ہے، اس سے بھی واقف ہے کہ کوئی اور ترکیب نہیں کہ وہ سائیکل پر جاتے ہوئے کھائی سے بچ سکے گا تو کیا یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس باپ نے جانتے بوجھتے اپنے بچے کو کھائی میں گرنے دیا، کیا کوئی صاحب اس سے انکار کرسکتے ہیں؟

اگر اس سے انکار نہیں کرسکتے تو اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ موجودہ نظام تعلیم سے بچے کا ایمان کیسے سلامت رہے گا؟ اگر خارجی واضافی دینی تعلیم کا انتظام نہیں ہے، (جس کو سائیکل میں بریک کا قائم مقام کہا جاسکتا ہے) جس میں تحفظ کا انتظام ہے کہ اسکول میں بچہ جو کچھ پڑھ کر آتا ہے اس کی اصلاح کی جاتی ہے اور اگر اس کو کوئی ایمانی توحیدی (Dose) دیا جاتا ہے، صباحی یا شبینہ مکتب ہیں، تعلیمی حلقے ہیں، کوئی دینی کتاب سنائی جاتی ہے، ماں باپ دین کی تلقین کرتے ہیں، اچھے اچھے شوق انگیز اور دین آموز قصے سنائے جاتے ہیں، گھر کا ماحول دینی ہے، تب تو یہ کسی درجہ میں بریک کے قائم مقام ہیں اور اگر ایسا نہیں تو آپ نے گویا اپنے بچوں کے کان میں کہہ دیا ہے کہ: "اسکول کی ہر بات مان لینا" یہ کان میں کہنے ہی کے مرادف ہے کہ آپ نے بچہ کا نام کسی اسکول میں لکھایا اور باہر سے کوئی انتظام نہیں کیا، گویا آپ نے اپنے بچہ کو ایک طرح کی ترغیب دی ہے کہ وہ ہر غیر اسلامی بات مانتا چلا جائے، اب اگر وہ مانتا چلا گیا اور باہر سے کوئی انتظام نہیں ہے، نہ اردو جانتا ہے کہ دینی کتابیں پڑھ سکے، نہ محلّہ میں کسی مکتب کا انتظام ہے تو آپ بتائیے کیا آپ "قوا أنفسكم وأهليكم ناراً" کے مخاطب نہیں ہیں؟

لکھنؤ کے ایک زنانہ جلسہ میں خواتین کی بڑی تعداد تھی، میں نے کہا ایک ماں کا قصہ آپ کو سناتا ہوں، ایک تعلیم یافتہ خاتون ایک دعوت میں شریک تھیں، بیبیوں نے دیکھا کہ وہ کچھ بے چین اور متفکر سی ہیں، باتوں میں ان کا دل لگ نہیں رہا ہے، ان کی عزیز بیبیاں اور سہیلیاں سب بیٹھی دلچسپی کی باتیں کر رہی ہیں، بہت دن کے بعد وہ اکٹھا ہوئی تھیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان خاتون کا دل و دماغ کہیں اور ہے، وہ کہیں اور دیکھ رہی ہیں، ان سے پوچھا گیا کہ بہن کیا بات ہے؟ طبیعت کچھ خراب ہے؟ کوئی اندرونی تکلیف ہے؟ بہت پوچھنے پر انہوں نے کہا کہ کچھ نہیں، میں گھر میں ماچس کی ڈبیا چھپانا بھول گئی، بچہ وہاں ہے، مجھے یہ کھٹکا لگا ہوا ہے کہ کہیں وہ اس میں سے تیلی نکال لے اور مسالہ سے رگڑ کر اپنے کپڑوں میں آگ لگالے، بیبیوں نے پوچھا: اللہ رکھے بچہ کی کیا عمر ہے؟ خاتون نے جواب دیا یہی دو سال کی، خیال کیجیے بچہ ماچس کے بکس کو کھولنا جانتا ہے یا نہیں؟ اگر جانتا ہے اور کھولے گا تو الٹی تیلی رگڑے گا یا سیدھی رگڑے گا جدھر مسالہ ہے، مگر:

عشق است و ہزار بدگمانی

محبت یہ سب چیزیں پیدا کر دیتی ہے، وہ چونکہ ماں ہیں، اللہ نے مامتا دی ہے، محبت دی ہے بچہ کی، اس لیے وہ باتیں جو بہت بعید از قیاس ہیں اور کہیں برسوں میں ہوتی ہیں، سب ان کے سامنے نقشہ کی طرح ہیں، بچہ کھیلتے کھیلتے وہاں پہنچا، ماچس کی ڈبیا اٹھائی، اس کو کھولا، اس نے کبھی دیکھا تھا، اپنی بڑی بہن کو یا بھائی کو کس طرح اس سے کام لیا جاتا ہے، اس نے اس کی نقل کی اور اپنے کپڑوں میں آگ لگالی، جب گھر گئے تو معلوم ہوا کہ (خدانخواستہ) یہ واقعہ پیش آیا، اتنے دور کے احتمالات کی وجہ سے وہ بی بی وہاں اس طرح بے چین نظر آتی تھیں کہ جیسے کوئی آدمی دہکتے ہوئے گرم پتھر پر کھڑا ہو، یا کوئی کانٹوں پر بیٹھا ہوا ہو۔

کیا دین کے منافی ماحول میں دین و ایمان سے محروم ہو جانے کے احتمالات جانی خطرات کے احتمالات سے زیادہ قوی نہیں ہیں، جو اس چاہنے والی ماں کے دل میں پیدا ہوئے؟ ہمارے بچے جو پڑھ رہے ہیں، جن کو آپ نے ایک دن نہیں بتایا کہ توحید کیا ہے؟ آپ نے کوئی انتظام اپنے شہر میں دینی مکاتب کا نہیں کیا، جہاں بچے پڑھ کر پھر اسکولوں میں جاتے اور اپنا ایمان بچانے کے قابل ہو جاتے، نہ گھروں میں وہ ماحول نہ محلّہ اور بستی میں یہ فضا، اسکولوں کو میں کیا کہوں، میں عربی مدرسوں کا آدمی ہوں، وہاں یہ حالت ہے کہ اب جو بچے آ رہے ہیں وہ بھی ایسی بنیادی باتوں سے ناواقف ہیں، جن کا ہمارے بچپن میں خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ کوئی مسلمان بچہ ان سے ناواقف ہوگا۔

اس صورت حال کا نتیجہ کیا ہوگا؟ نسل کی نسل دین سے بالکل ناآشنا ہوگی، اردو پڑھ نہیں سکے گی، آج یہ حالت ہو رہی ہے کہ ایک بڑے طبیہ کالج کے جس کی ایک تاریخ ہے، ایک طالب علم سے کوئی مضمون لکھوانا تھا یا خط لکھوانا تھا، تو سوچا کہ یہ صاحب تو طب کی کتابیں پڑھتے ہیں جو عام طور پر عربی، فارسی میں ہیں، بہت نیچے اتریئے تو اردو میں ہیں، ان سے کہا آپ لکھئے وہ لکھتے رہے لوگ سمجھتے رہے کہ لکھ لیا، دیکھا تو وہ ہندی میں تھا، ان سے کہا گیا کہ آپ یونانی طب پڑھتے ہیں اور اردو نہیں لکھ سکتے؟ انہوں نے کہا کہ ہمیں یہی پڑھایا گیا ہے، تو ایک ایسی نسل کے تیار ہونے کا محض اندیشہ نہیں، مشاہدے میں آ رہا ہے، دین کی بنیادی چیزوں سے ناواقفیت، بنیادی عقائد سے ناواقف، اللہ و رسول کا ہمارے دل و دماغ میں جو عقیدہ بسا ہوا ہے، اس سے ناواقف، یہ نسل پیدا ہوگئی ہے، اور جوانی کے قریب اب پہونچ رہی ہے، شروع ہونے کا زمانہ تو گیا، آنکھوں سے دیکھا گیا ہے کہ سیرت پر تقریر کرنی ہے، اسلامیہ اسکول ہے، کالج ہے، جامعہ ہے، اور ایک مسلمان نوجوان طالب علم کو کسی نے سیرت کا مضمون دیا، وہ ہندی میں لکھ کر لایا، اور اردو میں پڑھا الفاظ تو اردو اور رسم الخط ہندی اور یہ رسم الخط تو وہ چیز ہے کہ آرنلڈ ٹوائن بی (Arnold Toynbee) جو اس زمانے کا بڑا فلسفی مؤرخ (Philosopher Historian) ہے، اس نے لکھا ہے کہ اب کسی کتب خانہ کو آگ لگانے کی ضرورت نہیں، رسم الخط (Script) بدل دینا کافی ہے، اس سے اس قوم کا رشتہ اپنے ماضی سے بالکل ٹوٹ جائے گا اور اس کی پوری تہذیب اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ جائے گی، اور پھر جس طرف چاہو لے جاؤ، جو چیز کسی ملت کو اس کے ماضی سے، اس کے مذہب سے، اس کی تہذیب سے، اس کے کلچر سے ملاتی ہے، وہ رسم الخط ہے، رسم الخط بدلا نسل بدل گئی، آج ہندوستان میں یہی ہو رہا ہے، فرقہ وارانہ فسادات محض ملک کو بدنام کرتے ہیں، فائدہ ان کا کچھ نہیں ہے، تعلیم کا نظام بدلنا کافی ہے، آج سے ساٹھ برس پہلے اکبر مرحوم نے کہا تھا:

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے
دل بدل جائیں گے تعلیم بدل جانے سے

ایک طویل المیعاد منصوبہ بندی ہے، ذرا دیر لگے گی، تیس برس چالیس برس میں............

.................بقیہ صفحہ ۱۸ر پر

فکر ونظر

عقل واعتدال میں سلامتی کا راستہ

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ

ہاں صاحب کیوں بدلیں؟ ایک بار نہیں سو بار کہتے ہیں کیوں بدلیں؟ وہ تو اپنے طور طریقے بدلنے کے نہیں۔ الٹی ہم سے فرمائش کہ ہم اپنی وضع قطع رسم یک قلم بدل ڈالیں آخر کیوں بدلنے لگے؟ کیا ہم کوئی ایسے ویسے ہیں؟ ہماری وضع داری گویا کوئی چیز ہی نہیں ٹھہری۔ ہماری خودداری کے جیسے کوئی معنیٰ ہی نہ ہوئے! خوب رہی۔ ناصاحب ہم وضع بدلنے والے نہیں اور ہزار بار نہیں!.................تو شاعر کا مشہور مصرعہ:

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

تو اسی تیکھے طنزیہ مفہوم میں ہے اور اگر اس کی شرح کرنا ہے تو لامحالہ یہی تیور دم خم اختیار کرنے پڑیں گے بہ قول شخصے:

شرح وہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو!

لیکن شاعری کی خیالی رومانی فضا سے اتر کر اگر حقیقت پسندی کی ٹھوس زمین پر قدم اٹھاتے رہنا ہے تو البتہ یہ بات سنجیدگی کے ساتھ سوچنے اور سمجھنے کی ہے کہ ہم اپنی گھریلو وضع بدلیں یا نہ بدلیں اور بدلیں بھی تو آخر کیوں بدلیں؟

لیکن جواب کی منزل سے پہلے ایک لفظی الجھا وا اور ہے۔ پہلے تو چھٹکارا اسی سے حاصل کیجیے۔ وضع بدلنے کے معنی حاشا وکلّا یہ نہیں کہ آپ وضع داری کی شریفانہ عادت چھوڑ دیجئے اور خدانخواستہ بدوضعی کی پستی میں اتر آئیے! یہ زبان کا جیتا جاگتا عجائب گھر بھی کسی بھول بھلیاں سے کم نہیں۔ معمولی سے لفظ کے مادہ میں ذرا گل پھچل کر دیجیے اور معنیٰ ومفہوم کی شگوفہ کاریوں کے مزے لینے لگے۔ بھلا کہاں وضع کی سادہ ہیئت ہر رنگ وکیف سے الگ، نہ اس میں نہ اس میں۔ اور کہاں جو تمکنت کے ساتھ اس پر قائم رہ گئے تو وضع داری کے بام فلک نما پر جا پہنچے اور پھر جو ذرا پھسلے تو ننگ وناموس کو لٹاتے ہوئے چٹ بدوضعی کے کوچہ میں آگرے! توبہ ہے!

اب اس لفظی چکر سے نکل کر آیئے تو سامنا پھر اسی سوال کا، بال بال ذمہ داری اور سنجیدگی کے ساتھ کہ اپنی گھریلو زندگی میں تبدیلیاں کیوں کی جائیں؟ جواب مختصر سا لیکن کافی یہ ہے کہ کیوں نہ کی جائیں اور خیر یہ نفی واثبات کی بحث الگ رہی تبدیلیاں تو خود بخود ہو رہی ہیں ہم چاہیں یا نہ چاہیں زمانہ کے موکل کا زبردست ہاتھ تبدیلیاں کرائے بغیر مانتا کب ہے؟ زمانہ کے گزرنے کے معنیٰ ہی یہ ہیں کہ گھر ہو یا باہر مکین ہو یا مکان، جو کل تھا وہ آج نہیں ہے اور جو آج ہے وہ کل نہ رہے گا بہ قول خواجہ شیراز:

چناں نہ ماند و چنیں نیز ہم نہ خواہد ماند

اور ان سے بھی بڑھ کر عارفانہ مذاق اور ادبی طرح داری رکھنے والے اکبرالہ آبادی کہتے ہیں:

کیا شان ترے جمال میں ہے
ہر وقت زمانہ حال میں ہے

یہ زمانہ کا ہمہ وقتی حال'' ہمارے ہر قال وافعال'' سے برتر وبالاتر اور ہماری ''ہر چال'' بلکہ ہر خیال سے تیز تر ہے۔ ہم لاکھ جامد ومنجمد پتھر کے بت اور لکیر کے فقیر بنے رہنا چاہیں جب رہنے بھی پائیں۔

باپ بیچارہ کس چاؤ سے کس ولولہ سے گھر بنا جاتا ہے کہ بال بچے اور پھر ان کے بچے کچے اس میں یوں آرام سے رہیں گے یوں چین سے گذر بسر کریں گے اور صاحبزادہ سن تمیز کو پہونچے نہیں کہ انہوں نے اس میں ترمیم شروع کردی۔ نہیں یہ دالان تو ابا جان نے بالکل غلط رخ پر رکھا تھا اور یہ گوشہ تو دیکھئے کیسا بے تکا نکالا۔ اور لیجیے جامہ خانہ کے لیے کوئی جگہ ہی نہ رکھی! سو پچاس برس کی کون کہے دس ہی بیس سال گذرنے پر توڑ پھوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ مذاق، طبیعت، پسند اور تکلفات الگ رہے۔ ضروریات تک کا معیار بدل جاتا ہے۔ آرائش ونمائش کو الگ رکھئے راحت وآسائش تک کے پیمانے کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ نئے نئے ڈیزائن ابھرنے لگتے ہیں نئے نئے نقشے اپنی بہار دکھانے لگتے ہیں اور نئے نئے نمونے ذہن کی آنکھ کے سامنے گشت کرنے لگتے ہیں۔ چھت اب کی یوں نہیں یوں بنے گی۔ ڈاٹ اب کی ایسی نہیں ایسی لگے گی۔ نقشہ اب کی فلاں مستری سے نہیں فلاں انجینئر سے تیار کرایا جائے گا۔

یہ روز مرہ کی بیتی ہوئی سرگذشت ہے چند سال کی مدت میں دنیا کہاں سے کہاں پہونچ جاتی ہے اور دنیا والے کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔ دوسو برس ادھر کمرے کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ بڑے بڑے امیروں کو حویلیاں، بیگمات اور بادشاہوں کے محل تک چھان ڈالئے سب کھلے ہوئے دالانوں اور شہ نشینوں اور بغیر کواڑ اور دروازہ

کے سائبانوں اور دیوان خانوں ہی میں گزر کرتے تھے اور محض پردے ڈال ڈال کر مع اپنے پورے خاندانوں کے زندگی بسر کر لے جاتے تھے۔ لڑکیوں اور داماد لڑکے اور بہوئیں بھائی اور بھابھیاں سب، عروسی زچکی وغیرہ کے مرحلے کہنا چاہیے انہیں کھلے ہوئے مکانوں میں طے کرلیتے تھے۔ اب ہم سے کوئی اس طرح کا بے کمروں والا مکان کہے تو ہماری سمجھ ہی میں نہ آئے۔ بغیر کمرے کے ننگا بوچا سا مکان بھی کوئی مکان ہوسکتا ہے اور کمرہ بھی ایک نہیں اندر باہر ملا کر دو چار تو ہوں۔

زماں کے اثرات مکان پر کیسے نہ ہوں یہ ایک ہلکی سی مثال تو تعمیری تبدیلیوں کی بیان ہوئی۔ اب اس پر قیاس اور دوسری چیزوں کا کیجیے۔ ایک قریب اور سامنے کی چیز مکان کا فرنیچر ہے پہلے مکان کی آراستگی کے لیے فرش فروش تھے۔ معمولی گھروں میں چار پائیاں اور بنس کھٹیاں چٹائیاں اور دریاں۔ اس سے اونچے ہوئے تو سوزنی اور چاندنی جاجم اور قالین تخت اور مونڈھے اور آگے بڑھے تو گدے سے اور جب ''صاحب'' سے خلا ملا بڑھا اور ان کی تہذیب و معاشرت نے آنکھوں میں چکا چوندھ پیدا کرنا شروع کی تو چوپالوں بیٹھکوں، دیوان خانوں کے بجائے ڈرائنگ روم سجنے لگے۔ میز اور کرسیوں کا چلن عام ہوگیا دفتر اور اسکول والے اسٹول، بنچ اور ڈسک سے نا آشنا نہ رہے اور آگے بڑھ کر کوچ اور صوفے اور آرام کرسیاں، طرح طرح کی آرام دہ اور پر تکلف مخملی، گدے دار اور کمانی دار کرسیاں بہار دکھانے لگیں۔ کہاں تو جھونپڑیوں کو چراغ اور ڈیوٹ اور محلوں کو شمع کافوری اور فانوس جھاڑ اور کنول اور گلی کوچہ کو مشعلیں اور قندیلیں روشن کیے ہوئے تھیں

اور کہاں جب نئی روشنی کی آندھی آئی تو یہ سب ٹمٹمانے لگے۔ اور پھر جب دیکھنے والوں کی آنکھ کھلی تو دیکھتے کیا ہیں پہلے مٹی کے تیل کا لالٹین اور لیمپ، شیشہ کی چمنیوں اور گلوب کے ساتھ رات کو دن بنائے ہوئے ہیں۔ اور اسکے بعد جو دور آیا تو گیس کے ہنڈے اور بجلی کے قمقمے آسمان کے تاروں پر چشمک زنی کرنے لگے! مکانوں کے در و دیوار پر کہاں تو باپ دادا کے وقت میں بڑی خوشخطی اور صناعی سے لکھے ہوئے قطعے اور طغرے یا مقامات مقدس کے نقشے لٹکے رہتے تھے اور کہاں اب جو نئی تہذیب نے پر پرزے نکالے تو ڈرائنگ روم اور بڈروم میں ان کی جگہ طرح طرح کی تصویروں اور مرقعوں نے لے لی۔ بعض شائستہ اور شریفانہ اور بعض اب بس کیا کہا جائے ''ناگفتہ بہ'' ہی کا جامع لفظ ان کے لیے ہے۔

پرانے تمدن میں بڑی اہمیت کنوؤں کی تھی۔ کنوئیں کا گھر سے قریب ہونا ہی ایک نعمت تھی اور کنوئیں کا گھر کے اندر ہونا تو ایک نعمت عظمیٰ تھی۔ اب شہروں میں اور بڑے بڑے قصبوں میں جہاں کوئی دریا ہے نل گھروں کے اندر لگ گئے ہیں اور بجائے قدرتی صاف شفاف پانی کے ''مصنوعی ذرائع سے پکایا ہوا، فلٹر کیا ہوا پانی کہنا چاہئے کہ نپ نپ کر بکنے لگا ہے۔ پہلے امیروں کے مکانوں میں تہ خانے ہوتے تھے جہاں لو اور تپش کا پورا موسم آرام سے گذارا جاتا تھا اور صحن میں بلیاں گاڑ کر بڑے بڑے پنکھے ٹانگے جاتے تھے جن کے نیچے شامیں اور راتیں ہوا کھا کھا کر گذاری جاتی تھیں۔ اب بجلی کے پنکھوں نے کیا چھت والے اور کیا میز والے اس سارے نقشہ زندگی ہی کو باد ہوائی بنا ڈالا ہے۔

ناچ مجرے کے جلسے شرفاء کے گھروں میں کم تر ہی جمتے تھے۔ جب کبھی کوئی جلسہ کرنا ہوتا بھی تو رازداری وانتظام کھکھیڑ اٹھانا پڑتی۔ اب کچھ مشکل نہیں ایک ریڈیو سیٹ لگا لیجیے اور گھر کے زنانہ مردانہ میں جہاں بھی چاہے۔ جس مردانہ و زنانہ طائفہ کی آواز جب چاہے مزے سے سن لیا کیجیے اور کوئی دن جاتا کہ ٹیلی ویژن کی مدد سے جس کسی کے چاہیے درشن بھی کرلیا کیجئے گا۔ گویا یہ '' گوشہ بساط'' ''فردوس گوش'' تو بن ہی چکا ہے۔ ''جنت نگاہ'' اب بنا ہی چاہتا ہے.................. پاؤ گھنٹہ کی مدت میں کوئی کیا کیا آپ سے کہے سنے۔ یہ چند باتیں تو محض نمونہ اور مثال کے طور پر عرض کردی گئیں۔ اسی انداز پر جتنی مثالیں چاہئے خود اکٹھا کرتے جائیے۔ گھریلو زندگی کے اندر یہ سارے انقلابات ہمارے آپ کے دیکھتے دیکھتے ہوگئے اور روزانہ ہو رہے ہیں۔ زمانہ کا ہاتھ کون پکڑ سکا ہے۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں۔ تمدن معاشرت تہذیب تعلیم بلکہ سیاست کی بھی آئے دن کی تبدیلیوں کا اثر ہمارے گھروں کے ظاہر و باطن پر پڑنا لازمی ہے۔ اس سے چارہ نہیں اور نہ کوئی راہ بچنے کی ہے۔ لیکن تبدیلیوں تبدیلیوں میں فرق ہے۔ بعض کو آپ نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اور اپنے سر آنکھوں پر بٹھایا ہے اور بعض ایسی ہیں کہ آپ ہاں ہاں کرتے ہی رہے اور گھستی ہوئی پلتی ہوئی چلی آئیں۔ کوشش اپنی والی اس کی رکھئے کہ قابل قبول صرف انہیں تبدیلیوں کو سمجھئے جو عقل سلیم کے معیار پر پوری اتریں اور آپ کی روایات اخلاق وحکمت کے مطابق ہوں...... اندھا دھند ہر نئی چیز پر نہ گریئے اور نہ ہر نئے نام کے سایہ کے بدکئے۔ سلامتی کا راستہ عقل واعتدال والا ہے۔

☆☆☆☆☆

آدابِ زندگی

اسلامی نمونہ پیش کرنے کی ضرورت

مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی

عصر حاضر میں مسلمانوں کو خیر امت کی حیثیت سے مٹانے کی سازش ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے ،اسلام کے دورِ اول میں بھی یہودیت کے زیر سایہ اس طرح کے واقعات پیش آئے، اور بعد کی صدیوں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا، پانچویں صدی ہجری میں صلیبی جنگوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا،صلیبیوں نے عالم اسلام پر قبضہ کرنے اور امت مسلمہ کو فنا کے گھاٹ اتار دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے نور الدین زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی جیسے بہادر اور جانباز حکمرانوں کو حملہ آور صلیبیوں سے مقابلہ کرنے اور ان کو شکست فاش دے کر عالم اسلام سے نکالنے کی ہمت و طاقت عطا فرمائی، انہوں نے بیت المقدس کو ان کے قبضے سے آزاد کرا کے تاریخ اسلام میں ایک زریں باب کا اضافہ کیا۔

لیکن ساتویں صدی ہجری میں پھر مسلمانوں کو ایک سخت فتنے سے دوچار ہونا پڑا، اور وہ تھا تاتاریوں کا فتنہ، عالم اسلام پر ان کی یورش اور قتل وخونریزی کی گرم بازاری، تاریخ ان کے سیاہ کارناموں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی، مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے پھر اسی حملہ آور قوم کے ایک حکمراں کے دل میں اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا، اور شیخ جمال الدین نامی ایک بزرگ عالم کی اس کے دربار تک رسائی ہوئی، اور ان کے اثر سے یہ قوم اسلام کی نعمت سے نہ صرف یہ کہ سرفراز ہوئی بلکہ داعی اسلام بن کر ابھری۔

یہ دونوں واقعے اسلام کے خلاف علی الاعلان جنگ اور مسلمانوں کو منصب قیادت سے ہمیشہ کے لیے محروم کرنے کی سازش کا ایک اہم حصہ تھے، لیکن یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں برابر جاری رہا، اور امت مسلمہ اس طرح کے فتنوں اور آزمائشوں سے ہمیشہ دوچار رہی، اور ہر زمانے میں اس صورت حال کا احساس علمائے دین اور داعیان اسلام پر چھایا رہا، اور اس کے نتیجہ میں امت کی اصلاح وتربیت اور اس کو اپنے منصب پر واپس لانے کے لیے مخلصانہ جدوجہد بھی ہوتی رہی، اور جب بھی مخالفین کی طرف سے امت کو فرداً یا جماعۃً اپنے منصب سے محروم کرنے کے لیے نہایت سنجیدگی اور پوری منصوبہ بندی کے ساتھ کوششیں شروع ہوئیں تو داعیان اسلام کے دلوں میں امت کے تعلق سے بے چینی لاحق ہوئی، اور انہوں نے مسلمانوں کو موجودہ فتنوں اور آنے والی آزمائشوں سے آگاہ کرنے کی ہر ممکن کوشش صرف کی، اور ان کو اپنے حقیقی منصب کی طرف لوٹنے کی تلقین کر کے اپنی ذمہ داری کو صحیح طریقے سے انجام دینے کا ثبوت پیش کیا، اللہ تعالیٰ اپنے ان مومن بندوں کے بارے میں فرماتے ہیں:

"إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ، ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ" [سورہ حجرات: ۱۵] (ایمان والے وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اس کے رسول پر پھر شک وشبہ میں مبتلا نہ ہوئے اور لڑے اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے، وہ لوگ جو ہیں وہی ہیں سچے)۔

۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ میں پیش آنے والے واقعہ نے ثابت کر دیا کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جنگ کا انداز اب بدل گیا ہے اور اس کے لیے نہایت باریک بینی اور ہوشیاری کے ساتھ منصوبہ بندی کی جاتی ہے، اور یہ ثابت کرنے کی پوری کوشش ہے کہ اسلام ایک دہشت گردانہ مذہب ہے، اور مسلمان اس دہشت گردی کے علم بردار ہیں، لہٰذا ایسے مذہب کو اور اس کے ماننے والوں کو اس ترقی یافتہ جدید اور ٹکنالوجی کے دور میں باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ الزام بھی اپنی اہمیت کھو چکا اور اسلام کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے کے لئے مغربی ممالک کے لوگوں کا رجحان بہت زیادہ بڑھا، اور قرآن کریم کو براہ راست پڑھ کر ان کے دلوں میں اسلام قبول کرنے کا جذبہ بیدار ہوا، اور اس کے نتیجے میں مسلمانوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا، جب کہ یہ سارا مخالفانہ عمل اسلام سے متنفر کرنے اور اس کے متبعین کو برگشتہ کرنے کے لیے کیا گیا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے کلمہ کو بلند رکھا، اور آج صورت حال یہ ہے کہ اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہو رہا ہے۔

اسی کے ساتھ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف

صحابہ کرامؓ اور ہمارا معاشرہ

مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک اہم امتیازی صفت ان کا جذبہ اطاعت وفرمانبرداری ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو آخری حکم، فیصلہ کو آخری فیصلہ سمجھنا اور اس کو دل وجان سے تسلیم کرنا ان کا ایسا شعار بن گیا تھا کہ انھوں نے اپنے جذبات کی لگام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بات نکلی اور ادھر عمل کے لیے قدم اٹھے، یہ امتیاز کرنا مشکل ہونے لگا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے لفظ پہلے نکلا ہے یا عمل کے لیے قدم پہلے اُٹھے ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ مسجد میں داخل ہونے والے ہیں کہ اچانک کان میں یہ آواز آتی ہے کہ: بیٹھ جاؤ! وہیں بیٹھ جاتے ہیں، یہ گوارہ نہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز سن لینے کے بعد آگے بڑھ جاتے، جتنے قصے قضیے پیش آتے تھے وہ دربار رسالت مآب میں پہونچ کر فوراً ختم ہوجاتے تھے، اور یہ کیفیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی باقی رہی کہ جب کوئی مسئلہ پیش آیا اور اس میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم مل گیا فوراً مسئلہ حل ہوگیا، کسی نے اچھی تصویر کشی کی ہے:

شریعت کے قبضہ میں تھی باگ ان کی
بھڑکتی نہ تھی خود بہ خود آگ ان کی
جہاں کر دیا نرم نرماگئے وہ
جہاں کردیا گرم گرما گئے وہ

سخت سے سخت محاذ پر، بڑی سے بڑی جنگ میں اور خطرناک سے خطرناک موقع پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جان ومال اور اہل وعیال کی پرواہ کیے بغیر کود پڑنا ان کے لیے بائیں ہاتھ یا بچوں کا کھیل تھا؛ لیکن ان کا امتیاز یہ بھی ہے کہ جنگ آزمودہ ہوتے ہوئے اور جان جوکھم میں ڈال کر بڑے سے بڑا معرکہ سر کر لینے کی صلاحیت رکھنے کے باوجود جب برداشت کا موقع آیا اور خاموش رہ کر بلکہ ظاہری اعتبار سے دب کر صلح کرنے کا موقع آیا تو اس وقت بھی اطاعت و فرمانبرداری سے دست کش نہیں ہوئے جس کی کھلی مثال صلح حدیبیہ کا واقعہ ہے، اگر اس نظر سے غزوات وسرایا کا مطالعہ کیا جائے اور صحابہ کرامؓ کی اطاعت وفرمانبرداری کو دیکھا جائے تو اس کی نظیر نہیں ملے گی کہ کس طرح صحابہ کرامؓ نے سمع وطاعت کو نباہ کر دکھا دیا۔

لیکن ہمارا معاشرہ اس صفت سے بالکل خالی ہوچکا ہے، اطاعت ہے نہ فرمانبرداری، اگر قرآن مجید کی نصوص اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی پیش کردی جائیں تو بھی ایک طبقہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوگا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام اور ظاہری اعتبار سے پیچھے چلنے والوں کی اطاعت کی جانے لگی، ان کے جذبات کا خیال کیا جانے لگا، جو مطاع تھے وہ مطیع ہوگئے، جو مقتدا تھے وہ مقتدی ہوگئے، جن کو حق کہنا چاہیے تھا وہ عوام سے ڈر گئے، مصلحتوں کی آڑ لے کر حق کو چھپانے لگے، اس کا نتیجہ جو ہونا چاہیے تھا، وہ ہوکر رہا۔

☆☆☆

کرنے میں کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے کہ آج امت مسلمہ کے افراد میں صحیح اسلامی روح کی بڑی کمی ہے، اسلامی زندگی میں انحطاط اور اخلاقی زوال کا تناسب بہت زیادہ بڑھ چکا ہے، اس لیے ہمارے مذہبی تشخص کا نمونہ لوگوں تک پہونچنے میں دشواری پیش آرہی ہے اور ہم اپنی وہ شان امتیازی دنیا کے سامنے پیش کرنے سے قاصر ہیں جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا وَيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ" [سورۃ انفال:۲۹] (اے ایمان والو! اگر تم ڈرتے رہو گے اللہ سے، تو کردے گا تم میں شان امتیازی (دوسروں کے مقابلے میں)، اور دور کردے گا تم سے تمہارے گناہ اور تم کو بخش دے گا، اور اللہ بڑے فضل والا ہے)۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید فرماتے ہوئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف فرمایا:

"وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ، لَتَأْمُرُنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلَتَنْهَوُنَّ عَنِ الْمُنْكَرِ، أَوْلَيُوشِكَنَّ اللَّهُ أَنْ يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عِقَابًا مِنْ عِنْدِهِ، ثُمَّ تَدْعُونَهُ فَلَا يُسْتَجَابُ لَكُمْ" (اس ذات پاک کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ تم لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری انجام دیتے رہوگے، ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے تم پر کوئی عقاب (آزمائش) بھیج دے کہ پھر تمہاری دعائیں بھی قبول نہ کی جائیں)۔

☆☆☆☆☆

دینِ رحمت

خالقِ کائنات کا نازل کردہ نظام

مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی

یہ کل کائنات اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات کا مظہر ہے، اس کی مختلف صفات اس کی مخلوقات میں جلوہ گر نظر آتی ہیں، کہیں اس کی صفت رحمت کا ظہور ہے تو کہیں اس کی جباریت وقہاریت کارفرما نظر آتی ہے، کہیں وہ اپنی وسعت وکشائش کے دروازے بندوں پر کھول دیتا ہے، تو کہیں اس کی شان ''القابض'' نظر آتی ہے، کسی کو تحت الثری سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں تک لے جاتا ہے، تو کسی کو اسفل سافلین تک پہنچا دیا جاتا ہے، لیکن جو کچھ بھی وہ کرتا ہے اس میں اس کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے، اس نے جو چیز بھی پیدا کی وہ پورے توازن اور تناسب کے ساتھ پیدا کی، انسان کو اس نے اشرف المخلوقات بنایا، انسانی اعضاء کا تناسب اور جسم کا پورا نظام اس کی قدرت کی ایک دلیل ہے، خود ارشاد ربانی ہے:

''سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ'' [حم السجدۃ: ۵۳] (آگے ہم ان کو اطراف عالم میں اور خود ان کے اندر اپنی نشانیاں دکھادیں گے یہاں تک کہ یہ بات ان کے سامنے کھل کر آجائے گی کہ یقیناً یہی سچ ہے)۔

اور آج کی جدید سائنس بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے، جسم انسانی کے توازن وتناسب اور اس کی باریکیاں دیکھ کر بڑے سے بڑا منکر خدا بھی سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ اس کے پس پردہ ضرور کوئی طاقت کام کررہی ہے، جس کے ہاتھ میں کائنات کا نظام ہے، اور جس کی اجازت کے بغیر کوئی چیز بھی اپنی جگہ سے سرمو انحراف نہیں کرسکتی، انسان نے بلاشبہ اسباب تلاش کئے ہیں، اور وہ ایک سرے سے دوسرے سرے کو پکڑتا ہے، لیکن ایک حد پر جاکر اس کی بھی عقل کام کرنا چھوڑ دیتی ہے، اور پھر اگر اس میں ذرا بھی ہوش ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے کہ یہ سب اسباب در اسباب ہیں، ان کے پیچھے ضرور کوئی نہ کوئی ہاتھ ہے، جو ان اسباب کے لیے مسبب حقیقی کا درجہ رکھتا ہے، ایک امریکی عالم حیاتیات لکھتا ہے:

''غذا ہضم ہونے اور اس کے جزو بدن بننے کے حیرت انگیز عمل کو پہلے خدا کی طرف منسوب کیا جاتا تھا، اب جدید مشاہدہ میں وہ کیمیائی ردعمل کا نتیجہ نظر آتا ہے، مگر کیا اس کی وجہ سے خدا کے وجود کی نفی ہوگی، آخر وہ کون طاقت ہے جس نے کیمیائی اجزاء کو پابند کیا کہ وہ اس قسم کا مفید ردعمل ظاہر کریں، غذا انسان کے جسم میں داخل ہونے کے بعد ایک عجیب وغریب خود کار انتظام کے تحت جس طرح مختلف مراحل سے گذرتی ہے، اس کو دیکھنے کے بعد یہ بات بالکل خارج از بحث معلوم ہوتی ہے کہ یہ حیرت انگیز انتظام محض اتفاق سے وجود میں آگیا، حقیقت یہ ہے کہ اس مشاہدہ کے بعد تو اور زیادہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہم یہ مانیں کہ خدا اپنے ان عظیم قوانین کے ذریعہ عمل کرتا ہے جس کے تحت اس نے زندگی کو وجود دیا''۔

[علم جدید کا چیلنج، ناشر: مجلس تحقیقات اسلام لکھنؤ]

جدید سائنس نے انسانی جسم کے بارے میں جو تحقیقات کی ہیں اور اس کی باریکیوں کا جو جائزہ پیش کیا ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت اور زیادہ نظر آتی ہے، اور انسان بے ساختہ یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے:

''فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ'' [المومنون: ۱۴] (تو کیسی برکت والی ذات ہے اللہ کی جو سب سے بہتر پیدا کرنے والا ہے)۔

وہی خالق انسان جس نے جسم انسانی کے تناسب وتوازن میں ایسی باریکیوں سے کام لیا کہ اس کا تصور بھی بعض مرتبہ انسان کے بس سے باہر ہوجاتا ہے، اس نے دنیا میں انسان کو زندگی گذارنے کا طریقہ بھی بتایا ہے، اور اس نظام حیات میں بھی اس حکیم وخبیر نے انسانی جسم، انسانی طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے ایسی باریکیاں ملحوظ رکھی ہیں کہ کوئی بھی انسان اپنے طور پر ایسا نظام پیش کرنے سے قاصر ہے۔

یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ انسان کے جسم پر اور اس کے مزاج پر زمان ومکان اثر انداز ہوتے ہیں، آج کا انسان زمانہ قدیم کے انسان سے قدرے مختلف ہے، قدیم زمانے میں اس کا جسم زیادہ قوی وتنومند اور قد طویل ہوتا تھا، قوم عاد وثمود کے عذاب کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''كَأَنَّهُمْ أَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ'' [الحاقۃ: ۷] (جیسے وہ کھجور کے کھوکھلے تنے ہوں)۔

جگہ کی تبدیلی بھی انسان پر اثر ڈالتی ہے، عرب قوم زیادہ حقیقت پسند اور جفاکش سمجھی جاتی تھی، جب کہ عجمیوں میں تکلف وتصنع اور تانق ہوتا تھا، آج بھی مختلف ملکوں میں بسنے والے انسانوں میں نمایاں فرق نظر آتا ہے، کوئی کالا ہے، کوئی گورا ہے، کہیں کے باشندے بڑے مضبوط جسم والے

اور بڑے ڈیل ڈول والے نظر آتے ہیں تو کہیں کے نحیف اور لاغر دکھائی پڑتے ہیں، یہ اس حکیم و خبیر کی قدرت وحکمت ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام دنیا میں آئے، ایک ایسا نظام زندگی لے کر آئے جس میں اولین دور کے انسان کے جسم اور مزاج کی پوری رعایت تھی، اگر انسان اسی نظام کے مطابق زندگی گذارتا رہتا تو امن عالم کے لیے نہ کسی تحریک کی ضرورت تھی، نہ کسی دعوت کی، لیکن یہ تقدیری مسئلہ تھا، اللہ تعالیٰ نے شیطان کو اس کی اجازت دی کہ وہ انسان سے اپنی عداوت کا انتقام لے، اس نے آدم کے بیٹے قابیل کو بہلا پھسلا کر اس نظام سے ہٹایا جس کے نتیجہ میں پہلی مرتبہ امن عالم پر ضرب لگی، اور اس نے اپنے بھائی کو قتل کردیا، چونکہ یہ پہلی دستور شکنی تھی اور آسمانی نظام کے متوازی ایک نئے ایسے نظام کا آغاز تھا جو دنیا کے لیے فساد کا پیش خیمہ تھا اس لیے اس پر گرفت بھی سخت ہوئی، ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”لا تقتل نفس ظلما الا كان على ابن آدم الأول كفل من دمها لأنه أول من سن القتل“ [صحیح البخاری، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب خلق آدم علیہ السلام وذریتہٖ: ۳۳۳۵] (جو بھی قتل وغارت گری ہوگی اس کا وبال آدم کے اسی پہلے بیٹے کے سر جائے گا اس لیے کہ اس نے قتل کی راہ نکالی)۔

جب دنیا میں اس نظام سماوی سے سرکشی بڑھی تو اللہ تعالیٰ نے نبی بھیجے تاکہ وہ لوگوں کو راہ راست پر لائیں اور ان کو یاد دلائیں کہ وہ اللہ کی مخلوق اور اس کے بندہ ہیں، ان کی ذمہ داری ہے کہ اسی نظام کی پابندی کریں جو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے لازم فرمایا جس میں انسان کے مزاج کی پوری رعایت ہے اور وہی نظام امن عالم کا ضامن ہے، یہ سلسلہ جاری رہا، دنیا اپنی عمر طے کرتی رہی، اور زمانے کے تغیرات کے اعتبار سے اس نظام میں بھی جزوی تبدیلیاں ہوتی رہیں، تاکہ اپنے اپنے زمانہ کے اعتبار سے وہ نظام ان کا ساتھ دے سکے۔

اس قدیم دنیا میں جو غیر ترقی یافتہ تھی اور اس کے علاقہ بٹے ہوئے تھے، ایک ہی زمانہ میں کئی کئی انبیاء بھیجے گئے تاکہ اپنے اپنے علاقوں میں وہ تبلیغ و دعوت کا کام کرسکیں، سلسلہ نبوت اسی طرح جاری رہا، اور نظام عالم اسی ڈگر پر چلتا رہا، یہاں تک کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا زمانی رقبہ دنیا کی بقیہ پوری عمر پر محیط ہے، اور مکانی رقبہ پوری کائنات کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

”وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ“ [الأنبیاء: ۱۰۷] (اور ہم نے آپ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)۔

خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”أنا خاتم النبيين لا نبي بعدي“ [سنن الترمذی، کتاب الفتن، باب ما جاء لا تقوم الساعۃ حتی یخرج کذابون: ۲۳۸۰] (میں آخری نبی ہوں میرے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں)۔

جس طرح آپ کی بعثت آخری ہے اور عالمی ہے اسی طرح آپ کی شریعت بھی آخری اور عالمی ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے اس اخیر دور میں انسانوں کو جو نظام زندگی دیا گیا ہے اس میں زمان ومکان کی وسعت کا پورا لحاظ ہے، قویٰ کے اضمحلال، انسان کی جدت پسندی اور جدت طرازی کا اس میں پورا خیال رکھا گیا ہے، اب اس کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ انسانی مزاج کے بگاڑ اور اس کی کجی کے اعتبار سے اس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں اصل فطرت انسانی کی تصویر موجود ہے، جو نہ کسی دین کے بس میں ہے کہ اس کو پیش کرسکے اور نہ کوئی مذہب یا مکتب فکر اس کو پیش کرسکتا ہے، اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ اس خالق کائنات کا نازل کردہ نظام ہے جو نفسیات انسانی اور تقاضائے بشری سے نہ صرف واقف بلکہ اس کا خالق ومتصرف بھی ہے، اور اس کتاب ہدایت سے ماخوذ ہے جس کے بارے میں زبان اور فن کے ماہرین اس اعتراف پر مجبور ہیں کہ یہ کسی انسان کی تخلیق نہیں ہوسکتی۔

☆☆☆☆☆

چند جانبازوں کی ضرورت

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

موجودہ حالات اتنے غیر معمولی، اتنے تشویش ناک اور اتنے مہیب ہیں کہ اب معمولی اخلاقی اپیلوں یا حکومتی انتظامات سے کام نہیں چل سکتا، اس کے لیے تو ملک کے ضمیر کو جھنجوڑنے، اس کی روح کو چیخ کر پکارنے اور انسانی شرم وحیا، انسانیت دوستی اور خوف خدا کے آخری رمق سے کام لینے کی ضرورت ہے، جس سے یقیناً ابھی تک اس قدیم مذہبی ملک اور یہاں کا نرم اور پریمی دل خالی نہیں ہوا ہے، اس کے لیے چند آدمیوں کو اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر نکلنے کی ضرورت ہوگی، اس کے لیے کچھ مدت کے لیے اپنے تمام کاموں کو ملتوی اور بالائے طاق رکھنے کی ضرورت ہوگی۔ ☆☆☆

سخن دلپذیر

حقیقت پسندی اور خوش تدبیری

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے رفقاء کے ساتھ مدینہ ہجرت فرمائی تو وہاں دو طبقوں سے مسلمان نبرد آزما تھے، ایک یہود، دوسرے منافقین، یہودیوں کی مسلمانوں سے مخالفت علانیہ تھی، اور منافقین بغلی دشمن تھے، عبداللہ بن ابی ان کا سردار تھا، ابتداء اس شخص کا نفاق انصار پر ظاہر نہیں تھا اور وہ اس کو مخلص مسلمان باور کرتے تھے، مدینہ میں اس شخص کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے ایک خصوصی مقام حاصل تھا؛ بلکہ اہل مدینہ اس کو اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے، مگر اسلام کے بعد عبداللہ بن ابی کا خواب پورا نہ ہوسکا، غالباً اس لیے بھی عبداللہ بن ابی کے سینہ میں اسلام اور اہل اسلام کے خلاف آتش غضب سلگتی رہتی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقاء ''مہاجرین اور انصار'' کے ساتھ ایک مہم پر نکلے، اس میں عبداللہ بن ابی بھی شامل تھا، ایک مقام پر پڑاؤ کیا گیا، اور پانی لینے کے مسئلہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غلام اور انصاری صحابیؓ کے درمیان کچھ تکرار ہوگئی، بات آگے بڑھی، غلام نے مہاجرین کو اپنی مدد کے لیے آواز دی اور انصاری نے انصار کو پکارا اور یہ معمولی سا جھگڑا دو شخص کا نہ رہا؛ بلکہ دو جماعتوں — انصار و مہاجرین — کا اختلاف بن گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں ہی کی فہمائش کی اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ معاملہ رفع دفع ہوگیا؛ لیکن عبداللہ بن ابی ایسے مواقع کی تاک میں رہتا تھا، اس نے اس کو مہاجرین وانصار کے درمیان گروپ بندی کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی اور انصار کو عار دلائی کہ یہ نوبت اسی لیے آئی کہ تم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مکہ سے آنے والے ان کے ساتھیوں کی مدد کی، مہاجرین کے ساتھ ہماری مثال عربی زبان کے اس محاورہ کی ہے کہ اپنے کتے کو کھلا پلا کر موٹا کرو؛ تاکہ وہ تمہیں کو کھا جائے ''سمّن کلبك یأكلك'' پھر یہ بھی کہا کہ اب مدینہ پہنچ کر جو باعزت لوگ ہیں، وہ ذلیل لوگوں کو نکال باہر کریں گے۔

عبداللہ بن ابی نے یہ بات چند انصار کے درمیان کہی، ایک کم عمر انصاری صحابی حضرت زید بن خالد جہنیؓ نے بھی اپنے سر کے کانوں سے یہ بات سنی اور جذبۂ ایمان کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح صورتِ حال عرض کردی، حضرت عمرؓ پر جوشِ حق کا غلبہ رہتا تھا، اور باطل ان کو ذرا بھی برداشت نہیں تھا، انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ اس منافق شخص کا سر قلم کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر ایسا کیا گیا تو لوگ خیال کریں گے کہ اب محمد اپنے ساتھیوں کو بھی قتل کرا رہے ہیں۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے براہ راست عبد اللہ بن ابی سے واقعہ کی تحقیق کی، اس نے انکار کیا کہ میں نے ایسی بات نہیں کہی، انصار میں سے اکابر اور سر برآوردہ حضرات نے بھی اپنی ناواقفیت کی وجہ سے عبداللہ بن ابی کی تصدیق کی اور کہا کہ زید بچے ہیں، ان کی بات کا کیا اعتبار ہے؟ مگر خود وحی الٰہی سے حضرت زید کی تصدیق ہوئی، بہر حال اس ناخوشگوار واقعہ کا چرچا پورے قافلہ میں ہوگیا اور بعض بھولے بھالے مسلمانوں کا ذہن ایک حد تک اس سے متاثر بھی ہوا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کچھ زیادہ گفتگو نہیں فرمائی اور قافلہ کو کوچ کرنے کا حکم فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا عام معمول یہ تھا کہ صبح میں سفر شروع کرتے تو شام میں کہیں پڑاؤ کرتے اور شام میں سفر کا آغاز فرماتے تو صبح کے قریب کہیں منزل فرماتے؛ لیکن خلافِ معمول آپ صلی اللہ علیہ وسلم پورے دن اور پھر اس رات مسلسل چلتے رہے اور اگلے دن دوپہر کے وقت ایک جگہ خیمہ زن ہوئے، چلچلاتی ہوئی دھوپ، گرم ریت، بھوک و پیاس اور مسلسل سفر نے لوگوں کو تھکا کر رکھ دیا اور جو وقتی ناخوشگواری پیدا ہوگئی تھی، اس کا اثر بھی جاتا رہا، دراصل یہی مصلحت تھی جس کے پیش نظر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سفر کو غیر معمولی طول دیا؛ تاکہ لوگ اس تلخی کو بھول جائیں۔

پھر ایک عرصہ کے بعد جب عبداللہ بن ابی کا نفاق لوگوں کے سامنے کھل کر آگیا، حضراتِ انصار کو بھی اس کا خوب اندازہ ہوگیا، تو عبداللہ بن ابی کے صاحبزادے – جو مخلص مسلمان تھے – اور ان کا نام بھی عبداللہ ہی تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ معلوم ہوا ہے کہ آپ میرے والد کو قتل کرانے والے ہیں، اور واقعتاً وہ اپنے نفاق کی وجہ سے اسی لائق ہیں؛ لیکن مجھے اپنے والد سے بڑی محبت ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شاید میں ان کے قاتل کو نہ دیکھ سکوں! اگر واقعی ایسا ہی ہے تو

آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے حکم فرمائیے کہ میں خود اپنے والد کا سر قلم کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کردوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا اور حضرت عمرؓ کو بلا کر صورتِ حال بتائی کہ اگر میں نے اس وقت قتل کا حکم دیا ہوتا تو بہت سے لوگ بدگمان ہوسکتے تھے، اور آج صورتِ حال یہ ہے کہ خود یہ لوگ اس کے نفاق اور درپردہ عداوت سے پوری طرح واقف ہو چکے ہیں، اور خود ان کا لڑکا اس کے قتل کے لیے تیار ہے، حضرت عمرؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دوراندیشی اور معاملہ فہمی سے بہت متاثر ہوئے اور بے ساختہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے میں برکت رکھی ہے :"بارك الله في رأى رسوله"۔

یہ ایک مثال ہے حسن تدبیر اور جذبات پر عقل و فراست کو غالب رکھنے کی! اسی کو قرآن مجید نے "صبر" سے تعبیر کیا ہے، صبر کے معنی بزدلی اور پسپائی کے نہیں ہیں، بلکہ صبر سے مراد حسن تدبیر اور کسی اقدام کے لیے صحیح موقع و محل کا انتخاب کرنے کے ہیں، صبر یہ ہے کہ آدمی اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے آپ کو مشتعل اور بے برداشت ہونے سے بچائے؛ اس لیے کہ اشتعال اور غیظ و غضب کی حالت میں انسان کی قوتِ فیصلہ کم یا ختم ہوجاتی ہے، اور فراست و دوانش مندی کا دامن اس کے ہاتھوں سے چھوٹنے لگتا ہے؛ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کی حالت میں کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنے سے منع فرمایا ہے:"لایقضی القاضی و هو غضبان" کیوں کہ غصہ کی حالت میں آدمی معاملہ کی نوعیت کو سمجھنے اور اس کے بارے میں مناسب رائے قائم کرنے سے قاصر رہتا ہے، جیسے انفرادی اور شخصی معاملات میں یہ ضروری ہے کہ آدمی سنجیدہ حالت میں اہم فیصلے کرے، اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ضروری ہے کہ قومی اور اجتماعی مسائل میں ہم اشتعال اور غضب کی کیفیت میں کوئی فیصلہ کرنے اور قدم اٹھانے سے باز رہیں، ورنہ اس کا نقصان سنگین بھی ہوگا، دوررس بھی اور وسیع بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری حیاتِ طیبہ اس طرزِ عمل کی کھلی ہوئی مثال ہے، جنگ کی حالت ہو یا صلح کی، ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش تدبیری کو وقتی جذبات پر غالب رکھا، صلح حدیبیہ ہی کو دیکھئے: بظاہر صلح الف سے یا تک مسلمانوں کی امنگوں کے خلاف تھی، صلح نامہ لکھتے ہوئے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھا گیا، اہل مکہ کے نمائندہ نے اسے قبول نہیں کیا اور کہا کہ زمانۂ جاہلیت کے طریقہ پر "باسمك اللهم" لکھنا پڑے گا، اسے قبول کرلیا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی "محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم" لکھا گیا، دوسرے فریق نے "رسول الله" کے لفظ کو کاٹنے پر اصرار کیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر بھی تیار ہوگئے، حضرت علیؓ سے برداشت نہ ہوسکا، اور وہ کلمۂ حق کو اپنے ہاتھوں سے مٹانے کے لیے تیار نہ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے خود محو فرمادیا۔

پھر یہ بات طے پائی کہ مکہ سے جو مسلمان ہو کر مدینہ جائے اسے واپس کردیا جائے، اور مدینہ سے جو مرتد ہو کر مکہ آئے، اسے واپس نہ کیا جائے، یہ بالکل امتیاز پر مبنی دفعہ تھی، یہ بھی طے پایا کہ مسلمان اس سال واپس چلے جائیں، آئندہ سال آئیں اور صرف تین دنوں قیام کریں، نیز نیام میں رکھی ہوئی تلوار کے سوا کوئی ہتھیار ساتھ نہ رکھیں، یہ ساری باتیں عربوں کی روایات کے سراسر خلاف تھیں، حرم میں کبھی بھی اور کسی کو بھی آنے کی عام اجازت تھی، اپنے تحفظ کے لیے ہتھیار رکھنا یہ بھی عربوں میں ایک روایتی حق سمجھا جاتا تھا، اور مسلمانوں کے لیے یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ اپنے علانیہ دشمنوں کے درمیان جارہے تھے؛ لیکن ان غیر منصفانہ شرطوں کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منظور فرمایا، اکثر صحابہؓ کو یہ صلح بہت ناگوارِ خاطر تھی، حضرت عمرؓ سے تو برداشت نہ ہوسکا اور انھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرطِ جذبات میں کچھ ایسے سوالات کر لیے کہ ہمیشہ اس پر پشیمان رہتے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے احرام کھولا اور اپنے رفقاء کو اس کی تلقین کی تو راویوں کا بیان ہے کہ لوگ اس طرح ایک دوسرے کے بال مونڈ رہے تھے کہ گویا سر کاٹ ڈالیں گے۔

لیکن قرآن نے اسی صلح کو جو بظاہر ذلت آمیز تھی "فتح مبین" قرار دیا، (سورۃ فتح:۱) در اصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر یہ مصلحت تھی کہ مسلمان اہل مکہ سے مسلسل جنگ کی حالت میں ہیں، ہر صبح و شام خوف کی کیفیت سے گزر رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اہل مکہ کو معتدل فضاء میں اسلام اور اہل اسلام کو دیکھنے کا موقع نہیں مل پایا ہے، غلط فہمیوں کی دیواریں کھڑی ہیں، پھر اس خوف و دہشت کی فضاء میں کھل کر دعوتِ اسلام کا کام بھی نہیں ہوسکتا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات پر پورا اعتماد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے اندر جو کشش رکھی ہے، وہ بڑے سے بڑے دشمن کو بھی زیر کرے گی، اور جن لوگوں کو میدانِ جنگ میں فتح نہیں کیا جاسکا ہے، اسلام کی روحانی تعلیمات ان کے قلوب و اذہان کو فتح کرنے میں کامیاب ہوجائیں گی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ صلح حدیبیہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء کم و بیش چودہ سو تھے، اس

واقعہ کے صرف دوسال بعد مکہ فتح ہوا تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دس ہزار رفقاء عالی مقام مکہ میں داخل ہوئے، اور فتح مکہ کے دوسال بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حج فرمایا تو مسلمانوں کی تعداد ایک لاکھ سے متجاوز ہوچکی تھی، غرض آغازِ نبوت سے صلح حدیبیہ تک انیس سال کے عرصہ میں مسلمانوں کی تعداد چودہ سو سے کچھ زیادہ تھی اور اگلے چار سال میں ان کی تعداد یقیناً سوا ڈیڑھ لاکھ تک پہنچ گئی، جن میں سوا لاکھ کے قریب تو خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج میں شریک تھے، یہ اسی صبر کا کرشمہ ہے اور یہی وہ فتح مبین ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے خوش خبری دی تھی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل مسلمانوں کے لیے اسوہ ہے کہ جب مسلمان مشکل حالت سے گزر رہے ہوں، وہ سیاسی اور افرادی مغلوبیت سے دوچار ہوں تو اس وقت خصوصاً، اور ہر حال میں عموماً سماجی اور ملکی فضاء کو معتدل رکھنے کی کوشش کریں، جذبات پر عقل کو، تمناؤں اور آرزوؤں پر حقیقت پسندی کو، اشتعال اور نقصان دہ غیظ وغضب پر صبر اور خوش تدبیری اور مناسب موقع ومحل کے انتظار کو ترجیح دیں، ہر قدم پھونک کر اٹھائیں، ایسا ردِ عمل ظاہر نہ کریں جو خودکشی کے مترادف ہو، اور جس سے قومی اور اجتماعی نقصان ہو، جس سے تعمیر کے کام میں رکاوٹ پیدا ہوجائے اور ہماری ترقی معکوس ہو جائے، یاد رکھئے! ہندوستان کے موجودہ حالات میں فرقہ پرست عناصر کوشاں ہیں کہ مسلمانوں کو بے برداشت کردیا جائے، وہ سڑک پر نکل آئیں؛ تاکہ ظلم وزیادتی کا جواز پیدا ہوجائے اور مسلمانوں کو ایک شدت پسند گروہ کی حیثیت سے پیش کیا جائے، ان حالات میں ہمارا مشتعل اور بے برداشت ہوجانا فرقہ پرستوں کی بڑی کامیابی، اور حسن تدبیر کے ساتھ ایسی سازشوں کا مقابلہ کرنا فرقہ پرستوں اور ملک دشمنوں کی سب سے بڑی شکست ہے، یہ بظاہر ہزیمت ہے اور حقیقت میں فتح مبین!

☆☆☆☆☆

بقیہ صفحہ ۹ر کا ....

خود ایک ایسی نسل تیار ہوجائے گی جس کے نزدیک کفر وایمان کا فرق، توحید وشرک کا فرق، عقائد ومذاہب کا فرق سب بے معنی باتیں ہوجائیں گی، کچھ کرنا نہیں پڑے گا۔

مسلمان ماں باپ اس ڈر سے کہ ہمارے بچے کا کیریر خراب ہوجائے گا، اس کی مادری زبان اردو نہیں لکھاتے، اس کی دینیات کی تعلیم کا انتظام نہیں کرتے، بھلا ایمان کے ساتھ یہ بات جمع ہوسکتی ہے؟ مسلمان کی شان تو یہ ہے کہ اگر کسی طریقہ سے یہ معلوم ہوجائے کہ اس کے بچے کی تقدیر میں اسلام نہیں ہے یا یہ خدانخواستہ مسلمان نہیں رہے گا تو دعا کرے کہ اللہ اس کو خیر وعافیت سے اٹھالے، یہ مسلمان کی شان ہے۔

حضرت خنساء (رضی اللہ عنہا) ایک صحابیہ اور اپنے زمانے کی ایک بڑی شاعر خاتون ہیں، وہ بڑا دردمند دل رکھتی ہیں، انہوں نے ساری عمر اپنے دو بھائیوں کے مرثیے کہے جوان کو داغ مفارقت دے گئے تھے، کہا جاسکتا ہے کہ کسی زبان میں عورت کے کہے ہوئے مرثیوں کا اتنا بڑا ذخیرہ نہیں جو انہوں نے بھائیوں کی یاد میں یادگار چھوڑا ہے، ان کا پورا دیوان صرف بھائیوں کے مرثیے سے بھرا ہوا ہے، ایسا دردمند دل رکھنے والی خاتون ایک معرکہ جہاد میں اپنے ایک بیٹے کو بلاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ بیٹا جاؤ، تم کو میں نے اسی دن کے لیے پالا تھا، جاؤ اللہ کے راستے میں جان دے دو، پھر دوسرے بیٹے کو بلاتی ہیں، تیسرے بیٹے کو بلاتی ہیں، اور جب سب کی شہادت کی خبر آتی ہے کہ تو کہتی ہیں: "الحمد للہ الذی أکرمنی بشہادتہم" اس خدا کا شکر ہے جس نے ان کی شہادت کے ذریعے میری عزت بڑھائی، یہ ایمان کی شان ہے کہ اسلام پر سب کچھ قربان۔

آج مسئلہ یہ ہے کہ اس نسل کو کیسے بچایا جائے؟ کیسے مسلمان رکھا جائے؟ سرکاری تعلیم کی اصلاح کی کوشش کے ساتھ دینی تعلیم کا کوئی متوازی نظام بھی ہونا چاہیے، اسی بنیاد پر دینی تعلیمی کونسل قائم ہوئی ہے، ہم خدا کے یہاں اس نسبت کے ساتھ اس نام کے ساتھ جانا چاہتے ہیں کہ اس کے بندوں کی آئندہ نسل کے ایمان کو کچھ بچانے کی کوشش کرنے کے لیے تھوڑی سی ہماری شرکت تھی، ہمارا نام بھی اس دفتر میں لکھا جائے، اسی شوق میں ہم سب کر رہے ہیں، ورنہ ہم میں کوئی ایسا آدمی نہیں جو گھر سے فاضل اور کام سے فارغ ہو، ہم لوگ بہت مصروف لوگ ہیں، کم حیثیت ہیں، لیکن کم حیثیت آدمی بھی مشغول ہوتا ہے، پنساری کی دوکان، کرانہ کی دوکان بہت مصروف ہوتی ہے، اور رکشتہ اور اسکوٹر چلانے والے بھی بہت مصروف ہوتے ہیں، ہم کوئی بڑے آدمی نہیں ہیں، لیکن مصروف ہیں، بہت کام ہمارے کرنے کے ہیں، لیکن اس کام کو نجات کا ذریعہ، مغفرت کا وسیلہ اور خدا کے یہاں سرخروئی کا بہانہ سمجھ کر انجام دے رہے ہیں، آپ بھی آیئے اور ہمارا ہاتھ بٹائیے۔

☆☆☆☆☆

بحث و نظر

علامہ شبلی نعمانیؒ اور ان کی شاعری میں

ملت کی زبوں حالی اور اسبابِ زوال کی نشاندہی

مولانا محمد خالد ندوی غازیپوری

علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت کثیر الجہات اور جامع الکمالات ہے، علامہ شبلی ایک عبقری، عہد ساز، اپنی ذات میں ایک انجمن ایک دبستان، ایک مکتبِ فکر، بلند پایہ ادیب، مایہ ناز نثر نگار، منفرد مصلح و معلم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک با کمال شاعر و سخن شناس اور زبان و ادب کے بحر بیکراں کے ماہر شناور تھے، ان کی خدمات علم و ادب اور تحقیق و تصنیف تک محدود نہیں بلکہ ان کی تگ و دو کا دائرہ بہت وسیع تھا، مسلمانوں کے علمی، فکری، ملی، دینی، سماجی اور سیاسی زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جو ان کے مختصر زندگی میں کسی نہ کسی وقت ان کی توجہ کا مرکز نہ بنا ہو، مسلسل بیماریوں اور بے شمار موانع و مشکلات کے باوجود انہوں نے جو کر دکھایا، اسے غیر معمولی ہی کہا جا سکتا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کی جاوداں کارناموں، ان کی بلند پایہ تصنیفات سے اہل علم بخوبی واقف ہیں، ان کی عظمت اور قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ایک صدی سے اربابِ علم و دانش کی آنکھوں کانوں اور دل کا سرور بنی ہوئی ہیں، ان میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور تحقیق و تدقیق کی نکتہ آفرینیاں بھی، زبان و بیان کی حلاوت بھی ہے اور ادب و انشاء کی دل آویزی بھی، واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلیؒ کے افکار و نظریات کی قدر و قیمت ملی مسائل کے تناظر میں زیادہ ہوگئی ہے۔

علامہ شبلیؒ نے عصری تقاضوں کو ہمیشہ پیش نظر رکھا، اگر انہوں نے ماضی کی طرف دیکھا تو اس کا بنیادی مقصد ہمیشہ ان کے پیش نظر رہا، ماضی کی کمزوریوں کوتاہیوں اور خرابیوں کی نشاندہی اور حال کے آئینہ میں ان کا جائزہ لینا تھا تاکہ عظمت رفتہ کو لوٹانا اور مستقبل کو روشن و تابناک بنانا آسان ہو جائے بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ:

”علامہ شبلی نے ۳۲؍ برس ۱۸۸۴ تا ۱۹۱۴ء تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب اپنی شعلہ نفسیوں کے گرم اور اپنی نوا سنجیوں سے پرشور رکھا“۔

[حیاتِ شبلی: ص ۱۱]

علامہ شبلیؒ مصنف ہی نہیں تھے بلکہ مصنف گر بھی تھے، موصوف نے علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالسلام ندویؒ، مولانا حمید الدین فراہیؒ جیسی عبقری شخصیات ملت اسلامیہ کی تعمیر و تہذیب کے لیے تیار کیں، دار العلوم ندوۃ العلماء اور دار المصنّفین ان کی زندگی کے وہ شاہکار ہیں جو ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی اپنی آب و تاب سے برصغیر کو روشن کیے ہوئے ہیں۔

علامہ شبلیؒ نے ندوہ تحریک کے ذریعہ ایک طرف علمائے دین، علمبرداران مذہب کی اصلاح کی تو دوسری طرف علی گڑھ کالج میں اپنے خطبات و مقالات کے ذریعے جدید اذہان اور عصری تعلیم یافتہ طبقہ کو دین و ایمان کی دعوت بھی دی، اہل ندوہ کو خاص طور پر اور دیگر حضرات کو عام طور پر علم و تحقیق کا شعور دیا، شعر و ادب سے نوازا، تاریخ و تنقید سے باخبر کیا، اسی طرح علوم عصری اور ان کی اہمیت و ضرورت اور افادیت سے روشناس کیا اور خصوصاً نظریۂ علم میں دوئی کو مٹا کر اکائی کو اپنانے کا پیغام سنایا، بقول مولانا حالیؒ:

ادب اور مشرقی تاریخ کا ہو دیکھنا مخزن
تو شبلی سا وحید عصر و یکتائے زمن دیکھیں

ان تمام خصوصیات و امتیازات کے ساتھ علامہ شبلیؒ ایک قادر الکلام شاعر بھی ہیں، جتنے اونچے نثر نگار و مصنف ہیں اتنے ہی اونچے شاعر و سخن شناس بھی ہیں، ان کی شاعری حسن و عشق، گل و بلبل، ہجر و وصال کے خیالات سے بلند ہے، انہوں نے اپنی شاعری میں جن افکار و اقدار کی ترجمانی کی ہے، اس میں ملی مسائل کی بخیہ گری کے ساتھ ناصحانہ رنگ اور اخلاقیات کا غازہ بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے، پروفیسر مسعود الرحمٰن خان ندوی نے علامہ کی شاعری پر یوں کلام کیا ہے:

”شبلی نعمانی کی شاعری کو بنیادی طور سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ان کی غزلیہ شاعری فارسی میں ہو یا اردو میں، ان کے جذبات خفتہ اور احساسات خفیہ کی آئینہ دار ہے مگر ان کی نظمیں، مثنویاں، مسدس اور ان کی اصلاحی و دعوتی شاعری ان کے مقاصد کی نمائندگی کرتے ہیں“۔

[کاروانِ ادب، جنوری-مارچ]

علامہ شبلی کو ابتدا ہی سے شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی تھی، علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں ان کی

مثنوی ،قصیدے اور قومی مسدس بہت مقبول ہوئے اور ایک عرصہ تک محفلوں کو گرم اور روح کو تڑپاتے اور بیدار کرتے رہے ،ان کی مذہبی، اخلاقی تاریخی، سیاسی نظموں نے ملک میں ایک ہلچل پیدا کر دی تھی، جنگ طرابلس، حادثۂ مسجد کانپور، مسلم لیگ اور جنگ عظیم سے متعلق ان کی نظموں سے کون ہوگا جو تڑپا اور رویا نہ ہوگا۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے:

’’علی گڑھ کالج ایجوکیشنل کانفرنس اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے جلسوں میں وہ بڑی دھوم دھام سے اپنی نظمیں پڑھتے اور اپنے قصیدے سناتے تھے، سننے والے سر دھنتے تھے، آنسو بہاتے تھے اور قدر جاننے والے ان کی زبان کی فصاحت، معنی کی بلاغت اور طرز ادا کی خوبی کو مانتے تھے۔ستمبر ۱۹۱۳ء میں حکومت بنگال نے ایک اردو مجموعہ اشعار پر پابندی عائد کی، ان میں ایک نظم علامہ شبلی کی بھی تھی، اس واقعہ سے نظموں کے اثرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، اس کے باوجود شبلی کو عرصہ تک نقادانِ شعر و ادب نے لائق اعتناء خیال نہیں کیا، اور شعراء کے تذکروں میں ان کا نام تک نہیں لیا گیا، خود ان کے شاگرد مولانا عبدالسلام ندویؒ نے بھی ’’شعر الہند‘‘ میں ان کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ علامہ کا ذوقِ شعرو شاعری ایک مسلمہ حقیقت ہے، وہ ایک پختہ اور قادر الکلام شاعر تھے‘‘۔

ذاکر سلام سندیلوی نے صحیح لکھا ہے کہ:

’’تمام نثر نگاروں میں آزاد اور حالی کا ذکر بحیثیت شاعر کے بھی کیا جاتا ہے، لیکن شبلی کو اس محفل میں جگہ نہیں دی جاتی ہے، یہ شبلی کے ساتھ بے انصافی ہے، جہاں تک شاعرانہ صلاحیت کا تعلق ہے، شبلی آزاد اور حالی سے کم نہیں، اس لیے شبلی کو مؤرخ اور نقاد کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تسلیم کرنا ہمارا فرض ہے‘‘۔ [آثارِ شبلی]

’’کلیاتِ شبلی‘‘ میں وہ نظمیں جنھوں نے مسلم رائے عامہ کو بہت زیادہ متاثر کیا اور مسلمانوں میں اپنے ملی تشخص اور اپنے اسلامی وجود کا احساس ہوا، اور اس دور کی ظالمانہ و ملحدانہ روایات پر مبنی حکومتوں کا جس پُر اثر انداز میں تجزیہ آپ کے کلام میں ملتا ہے، اور خصوصاً آپ کی سیاسی نظموں میں گلبانگ فطرت کا یہ رنگ غالب ہے، اسکی نظیر کسی دوسری نظم میں نہیں ملتی ہے، عالم اسلام کے سیاسی حالات، مسلمانوں کی پستی وزبوں حالی اور ذلت و رسوائی پر شبلی جس طرح تڑپے اور بے قرار ہوئے ہیں، شعراء کے ہاں اس کی مثال شاید ہی ملے، اصلاً ان کے یہی خونی آنسو نظم کے پیکر میں ڈھلے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تاثیر اور اثر انگیزی کے لحاظ سے ان نظموں کا اردو ادب میں جواب نہیں، اس سلسلہ کی سب سے اہم اور قابل ذکر وہ نظم ہے جو انھوں نے ’’شہر آشوب اسلام‘‘ کے نام سے لکھی ہے اور جو رفاہِ عام لکھنؤ کے اجلاس میں پڑھی گئی تھی:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ جب یہ نظم پڑھی گئی تو اس کا یہ اثر تھا کہ سر سے لے کر پاؤں تک ماتم برپا ہو گیا، اس پر آشوب زمانے میں شبلیؒ کے علاوہ شاید ہی کسی نے عالم اسلام کی صورتحال اس پُرسوز اور درد انگیز لہجے میں بیان کی ہو، عالم اسلام پر جو کچھ گزر رہی تھی، وہ تمام کاروائیاں انگریزوں کی طرف سے یا پھر ان کی شہ پر ہو رہی تھیں جو خود کو انسانیت نواز اور امن کا علم بردار بتاتے تھے، علامہ شبلیؒ کہتے ہیں:

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں تاکے یہ حشر انگیزیاں کب تک

علامہ شبلیؒ کا خیال تھا کہ دولتِ عثمانیہ کا زوال دراصل شرعِ ملت کا زوال ہے اور پھر اگر یہ خلافت محفوظ نہ رہی، توحید کا گلبانگِ اذاں، احترام سجدہ گاہ قدسیاں کہاں محفوظ رہ سکیں گی:

زوال دولتِ عثماں، زوال شرعِ ملت ہے
عزیزو! فکر فرزند وعیال و خانماں کب تک
خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھوگے تم یہ چیستاں کب تک

اسی طرح علامہ کی’’ تنزل اسلام کا اصلی سبب‘‘ والی نظم ملت کی زبوں حالی اور زوال کا جو تجزیہ کیا ہے، وہ ایک اچھوتا انداز ہے جس کے بارے میں انہوں نے فرمایا ہے۔

دو واقعے جب ایک ساتھ ہوتے ہیں تو ان کو عام طور سے لازم و ملزوم یا ایک کو سبب اور دوسرے کو مسبب سمجھ لیا جاتا ہے، مسلمانوں میں اس وقت:

کون ہے شائبہ شرک سے خالی اس وقت
کون ہے جس پہ فریب ہوس خام نہیں
اب عمل پہ جو نظر کیجیے آئے گا نظر
کہ کسی ملک میں پابندئ احکام نہیں
الغرض عام ہے جو چیز وہ بیدی ہے
صاف یہ بات ہے دھوکہ نہیں ابہام نہیں
ان حقائق کی بنیاد پر سبب پستی قوم
ترکِ پابندئ اسلام ہے اسلام نہیں

☆☆☆☆☆

تحفۂ ربانی

سفرِ معراج کا پیغام

ڈاکٹر سراج الدین ندوی

معراج کا سفر انسانی تاریخ میں حیرت انگیز واقعہ ہے۔کسی انسان کا ایک رات کے چند گھنٹوں میں مکہ سے فلسطین اور فلسطین سے سات آسمانوں تک آنا جانا بشری ڈکشنری میں ناممکنات کے ذیل میں آتا ہے۔لیکن جب کوئی امین وصادق پیغمبر اپنے بارے میں خبر دے کہ میں نے یہ سفر کیا ہے اور اللہ یہ گواہی اپنے مقدس فرشتہ کے ذریعہ دے کہ: "پاک ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اُس مسجد تک جس کے ماحول میں اس نے برکت دی ہے، تا کہ اسے اپنی کچھ نشانیوں کا مشاہدہ کرائے حقیقت میں وہی ہے سب کچھ سننے اور دیکھنے والا" [الاسراء:۱]۔پھر یہ گواہی قیامت تک کے لیے ایک ایسی کتاب میں درج کردی جائے جس کی سب سے پہلی صفت ہی "لاریب فیہ" ہوتو یقین نہ کرنے اور ایمان نہ لانے کی کیا وجہ باقی رہ جاتی ہے۔مسلمان اور مومن ہونے کا دعویٰ کرنے والے کبھی اس واقعہ پر شک کا شائبہ بھی اپنے دل میں نہیں لاسکتے۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی صبح جب یہ واقعہ بیان کیا تو کفار مکہ کو مذاق اڑانے کا نیا بہانہ ہاتھ آگیا۔

ایک شخص نے حضرت ابوبکرؓ کو اطلاع دی کہ آپ کے دوست یہ فرمارہے ہیں کہ وہ رات سات آسمانوں کی سیر کر کے آئے ہیں۔یہ سن کر ابوبکرؓ نے فرمایا: "اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات کہتے ہیں تو سچ کہتے ہیں"۔ایک مومن کے ایمان کی کیفیت یہی ہونی چاہیے۔اس واقعہ سے سب سے پہلا پیغام یہی ملتا ہے کہ ہمارے پاس مستند ذرائع سے جو قول رسولؐ پہنچے، ہم اس کی تصدیق کرنے میں تامل نہ کریں۔ ایک مسلمان کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ رسول اکرمؐ کی کسی بات پر شک کرے۔اس کے ایمان وعمل کے لیے یہ بات کافی ہے کہ یہ کام رسولؐ نے کیا ہے یا اس کام کا آپؐ نے حکم دیا ہے۔

سفر معراج میں نبیؐ نے بیت المقدس میں تمام انبیاء کی امامت فرمائی تھی۔اس سے معلوم ہوا کہ اب تمام انسانوں کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ آپؐ کو اپنا نبی اور رسول تسلیم کریں۔بیت المقدس میں آپؐ کا تمام انبیاء کی امامت فرمانا اس بات کا اعلان ہے کہ اب سابقہ انبیاء کی امامت ختم ہوگئی ہے،اب عیسیٰؑ اور موسیٰؑ کے ماننے والوں کو بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنا ہوگی۔اس امامت سے صرف یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ حضرت محمدؐ تمام انبیاء سے افضل ہیں مناسب نہیں۔خدا کی شریعت میں ہر پیغمبر کا ایک خاص مقام ہے۔قرآن میں کہا گیا ہے کہ: "یہ رسول ہیں ہم نے ان میں ایک کو دوسرے پر فضیلت عطا فرمائی،ان میں کسی سے اللہ نے کلام فرمایا اور کوئی وہ ہے جسے سب پر درجوں بلندی عطا فرمائی" [البقرہ:۲۵۳]۔اللہ کے تمام فرستادے معصوم ہیں اور یکساں قابل احترام ہیں۔ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار یا توہین اہل ایمان کو جہنم تک پہنچا سکتی ہے۔آپؐ امام الانبیاء ہیں،آپؐ خاتم النبیین ہیں،یہ وہ خصوصیات ہیں جو آپ کو دوسرے نبیوں سے ممتاز کرتی ہیں۔سفر معراج کا دوسرا پیغام یہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کے پیغمبر ہیں۔اس پیغام کا تقاضا ہے کہ مسلمان اپنے رسول کی دعوت کو تمام انسانوں تک پہنچائیں۔دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف کرائیں۔

سفر معراج کا آغاز مسجد حرام یعنی کعبہ سے ہوا۔ بیت المقدس سے آسمان کی جانب پرواز شروع ہوئی۔واپسی میں بھی آپ پہلے بیت المقدس تشریف لائے،وہاں سے کعبہ آئے اور پھر اپنے مستقر پر گئے۔یہ بھی ہوسکتا تھا کہ آپ جہاں آرام فرما تھے وہیں سے آپ کو سیدھے آسمان پر لے جایا جاتا۔اس سے معلوم ہوا کہ دین میں مسجد کی بہت اہمیت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ کسی بھی سفر سے واپسی پر پہلے مسجد نبویؐ میں تشریف لاتے اور اپنی ازواج کو اپنی آمد کی اطلاع دیتے۔ایک مسلمان کے لیے مسجد ہی اس کا مرکز ومحور ہے۔اسے دن میں تو پانچ بار جانا ہی ہے اس کے علاوہ بھی اس کا دل مسجد میں ہر وقت پڑا رہنا چاہیے۔ایک اچھے مومن کی یہ پہچان ہے کہ ایک نماز کے بعد وہ دوسری نماز کا بے صبری سے انتظار کرتا ہے۔مساجد اسی بیت اللہ کا عکس اور قائم مقام ہیں جس کا طواف کیا جاتا ہے۔مسجد ہمیں اللہ کی حاکمیت اور بندے ہونے کا احساس کراتی ہے۔اسی لیے مسجد کی تعمیر،اس کی دیکھ بھال اور اس کی حفاظت کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔مسجد سے شروع کیا گیا سفر بابرکت بھی ہوگا اور محفوظ ومامون بھی۔خاص طور پر جب ہم کسی اہم سفر پر جائیں تو مسجد میں دو رکعت نماز پڑھ کر جائیں۔جب ہم کسی سفر سے واپس ہوں تو پہلے مسجد میں جائیں اور دو رکعت نماز ادا کریں۔اللہ کے سامنے سربسجود ہو جائیں کہ اس نے سفر میں ہماری حفاظت فرمائی۔

معراج میں قبلہ اول بیت المقدس سے سفر کا آغاز بھی اہمیت کا حامل ہے۔یہ سفر حرم مکی سے بھی شروع ہوسکتا تھا اور انبیاء کو حرم مکی میں بھی جمع کیا

جاسکتا تھا۔بیت المقدس کوسفر معراج کی ایک منزل بنانے کا مقصد قبلہ اول کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے۔ امت مسلمہ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ اس مسجد کی بھی اہمیت ہے اور مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ یہاں اللہ اکبر کی صدا بلند کریں۔الحمد للہ امت مسلمہ نے قبلہ اول کی اہمیت کا ہمیشہ احساس کیا ہے۔اس کے جیالوں نے ہمیشہ اس کی حفاظت کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے ہیں اور آج بھی غزہ کے مجاہدین اور ان کے پشت پناہ سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔معراج کے سفر کا یہ پیغام ہے کہ اہل اسلام بیت المقدس کے تحفظ کو ترجیح دیں اور اس کے غاصبین کا ہر طرح بائیکاٹ کریں۔

کہتے ہیں کہ سفر معراج کا تحفہ نماز ہے۔اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز مومن کی معراج ہے۔معراج میں اللہ کے نبی اللہ سے ہم کلام ہوئے۔نماز میں ایک مومن اللہ سے ہم کلام ہوتا ہے۔وہ اللہ کی حمد وثنا کرتا ہے،وہ اس سے عرض ومعروض کرتا ہے،وہ اس سے اپنا حال دل بیان کرتا ہے اور اس کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے۔ایک بندہ حالت نماز میں ہی اللہ سے سب سے قریب ہوتا ہے اس وقت اس کے اور خدا کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔وہ تصور کی آنکھوں سے اللہ کو دیکھتا ہے اور اس کا ایمان اسے یہ احساس کراتا ہے کہ اللہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

نماز کی اہمیت اور فضیلت پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے قرآن مجید میں اس کا ذکر تقریباً سات سو بار آیا ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شمار مواقع پر اس کی اہمیت بتائی ہے۔آپ ؐ نے فرمایا نماز دین کا ستون ہے،جس نے نماز کو قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے اسے چھوڑ دیا اس نے دین کی عمارت کو گرادیا۔سفر معراج کا پیغام ہے کہ اہل ایمان اللہ کے سامنے خود سپردگی کردیں اور اس کا عملی اظہار نماز ہے۔اذان کی آواز سن کر یا نماز کا وقت ہونے پر ایک مسلمان جب نماز نہیں پڑھتا تو گویا وہ عملاً اس بات کا انکار کرتا ہے کہ وہ کسی کا بندہ اور غلام ہے وہ اللہ کی فرمانروائی اور اقتدار اعلیٰ کا انکار کرتا ہے۔نماز معراج کا تحفہ ہے دوسرے لفظوں میں جس انسان کو بلند ہونا ہے اسے چاہیے کہ وہ نماز پڑھے۔

معراج کے سفر میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنت اور دوزخ کا مشاہدہ کرایا گیا۔وہاں کے مناظر دکھائے گئے،دوزخ کے مناظر سے آپ کو خوف محسوس ہوا،یہ خوف آپ کو اپنی امت کے لیے بھی ہوا کہ مبادا میری امت اس کا ایندھن بن جائے۔روایت میں آتا ہے کہ آپ ؐ کو وہاں اپنے آگے آگے کسی کے چلنے کی آواز آئی۔آپ ؐ نے معلوم کیا کہ یہ کس کے قدموں کی آواز ہے۔بتایا گیا کہ یہ حضرت بلال ؓ ہیں۔اس کا مطلب ہے کہ اسلام میں عمل کی اہمیت ہے کسی نسب اور رنگ یا علاقہ کی نہیں۔صحابہ کرام ؓ کی ایک کثیر تعداد ہے جو اپنے تقویٰ کی وجہ سے ممتاز ہے،اس جماعت میں صدیق اکبر ؓ،عمر فاروق ؓ،عثمان غنی ؓ اور علی حیدر ؓ جیسے جلیل القدر صحابہ ہیں،عشرہ مبشرہ ہیں۔مگر قدموں کی آواز حضرت بلال ؓ کی سنائی جارہی ہے۔اس کا مقصد اس کے سوا کیا ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں رنگ،علاقہ،زبان اور نسب کی نہیں، انسان کے ایمان اور عمل کی اہمیت ہے۔آج مسلمان نسب کی بنیاد پر منقسم ہیں،ان میں اراذل واشراف کی تقسیم ان کے نسب کی بنیاد پر کی گئی ہے۔جب کہ اسلام میں اس کی گنجائش نہیں۔دین میں شرف وبزرگی کا معیار تقویٰ ہے۔معراج کا ایک پیغام یہ ہے کہ ہم سب اللہ کے بندے ہیں، ہمارے درمیان اونچ نیچ کا کوئی تصور نہیں ہے، یہاں ایک غلام ایک آقا سے پہلے جنت میں جاسکتا ہے۔یہاں ایک کالا گورے پر اپنے نیک اعمال کی بنیاد پر فضیلت کا حق دار ہے۔

سفر معراج کا ایک پیغام یہ ہے کہ انسان کی بلندی کی کوئی انتہا نہیں ہے،وہ جتنا چاہے بلند ہوسکتا ہے،ساتوں آسمان اس کے زیر قدم ہیں۔اس سے ایک طرف بحیثیت انسان دیگر تمام مخلوقات پر اس کی فوقیت ثابت ہوتی ہے،دوسری طرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی ہر شے اس کے لیے مسخر ہے اور وہ ان تمام اشیاء سے مستفید ہوسکتا ہے،تیسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے کوئی شے بھی اس کے لیے معبود کی حیثیت نہیں رکھتی۔اسے کسی کے سامنے اس لیے سر نہیں جھکا دینا چاہیے کہ وہ شے اس کے لیے بہت کارآمد ہے۔اس کے دل میں جب جب یہ خیال آئے تو اس کو یاد رکھنا چاہیے کہ سفر معراج میں ایک انسان نے ہر شے پر فوقیت پائی تھی۔

روایت میں آتا ہے کہ معراج کا سفر طائف کے بعد ہوا ہے۔اس سے یہ پیغام ملتا ہے کہ دین کے راستے میں جب آزمائشیں اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہیں تو داعی کی بلندی کا سفر شروع ہوتا ہے،جب اس پر مصائب کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں تو اللہ اس پر انعام کی بارش کرتا ہے۔سفر معراج کا ایک پیغام یہ ہے کہ زمین والے اللہ کے کسی بندے پر اپنے دروازے بند کرتے ہیں تو اللہ اس پر آسمان کے دروازے کھول دیتا ہے۔

الغرض سفر معراج اپنے اندر بے شمار پیغامات رکھتا ہے اور اس سے اہل ایمان کو بیش قیمت دروس حاصل ہوتے ہیں۔افسوس ہے کہ امت مسلمہ اس واقعہ کی نسبت سے بھی بہت سی بدعات وخرافات میں مبتلا ہے وہ اس موقع پر محفلیں آراستہ کرتی ہے، چراغاں کرتی ہے لیکن اس کے پیغام کو بھول جاتی ہے۔اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں سفر معراج کے پیغام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے،آمین۔

☆☆☆☆☆

ادبِ اسلامی

محترمہ امۃ اللہ تسنیم مرحومہ کی

"قصص الانبیاء" کا بچوں کے ادب میں حصہ

محمود حسن حسنی ندویؒ

"بچوں کی قصص الانبیاء" یہ محترمہ امۃ اللہ تسنیم ہمشیرہ مرحومہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وہ مقبول عام کتاب ہے جس نے نئی نسل کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے اور صدق وصفا، ایمان ویقین، توحید وعبادت اور تعلق مع اللہ کی راہ پر لانے کا بہت ہی سادہ انداز واسلوب میں حصہ پیش کیا ہے، کتاب کے نام سے ہی کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگانا آسان ہوجائے گا۔ آسان اردو میں مشکل مباحث عقائد کا ذکر یہ کوئی آسان بات نہیں تھی جو اردو داں طبقہ کے لیے سامنے آئی، اس کا پہلا حصہ سیدنا آدم علیہ السلام، سیدنا نوح علیہ السلام، سیدنا ہود علیہ السلام اور سیدنا صالح علیہ السلام کے قصوں پر مشتمل ہے جو قرآن پاک سے لیے گئے تھے اور بچوں کی نفسیات اور ان کی عقلی سطح کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے لہجہ اور طرز کلام کا خیال کرتے ہوئے لکھے گئے۔

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے پیش لفظ میں اس کام کی بڑی قدردانی فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"رائے بریلی کا ہی ایک سیدزادہ کبھی ہجرت و جہاد کے شوق میں وطن سے بے وطن ہوا تھا اور حلقہ بالاکوٹ (پشاور) کی سرزمین پر اپنی زندگی کے حق سے جدا ہوگیا۔ آج اللہ کے دین کو نصرت کے لیے تلوار سے بھی کچھ زیادہ قلم کے مجاہدوں کی ضرورت ہے، اسی خاندان سے پھر ایک سید اٹھا اور اب کی اس کے ہمراہ ایک برقعہ پوش سیدانی بھی ہے۔ غزوات نبویؐ میں شہیدوں اور غازیوں کی خبرگیری اور تیمارداری کرنے والیوں کی یاد تازہ کر دینے والی، آج مسلم خاتون غیروں کی دیکھا دیکھی کہاں سے نکل کر آج کہاں پہنچی ہے، گھر سے نکل کر اسکول، اسکول سے کالج اور پھر میوزک ہال اور بے حجابی اور بے حیائی کا ہراڈہ اور ہر منزل، عین اس فضا میں اور اس ماحول میں جو بہن دین کی خدمت کے لیے نکلی ہیں، وہ اپنی صنف کا گناہ کچھ تو ہلکا کر رہی ہیں۔ اللہ ان کی ہمت میں برکت اور ارادوں میں استقلال نصیب کرے۔ (آمین)"

[از: پیش لفظ]

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی "قصص النبیین" بلاد عربیہ، ممالک اسلامیہ بلکہ عالم اسلام میں بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے نرالا اور نہایت منفرد اسلوب میں پیش کیا جانے والا علم عقائد اور طرز معاشرت میں شریک ہے اور یہ کہ کس طرح باطل سے مقابلہ میں حق کا بول بالا ہوا، اور "جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقاً" [سورۂ اسراء:۸۱] (حق آگیا، باطل چلا گیا، بے شک باطل مٹنے ہی کے لیے ہے) کیسا سامنے آیا۔

اسی لیے اسے بچوں کا علم کلام کہا گیا، ان کی بہن سیدہ امۃ اللہ تسنیم مرحومہ نے قرآن مجید کے انہی قصوں کو بعض کے قصوں کو اضافہ کے ساتھ جب پیش کیا تو کیسے اس کی پذیرائی نہ ہوتی۔

مولانا دریابادیؒ نے اس کے اسلوبِ نگارش وطرزِ ترجمانی کی اہمیت وافادیت کو دو جملوں میں بڑے زوردار انداز سے پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"کتاب ترجمہ نہیں، ترجمہ سے بڑھ کر ہے، زبان کی خوبیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں: 'مشک آنست کہ خود ببوید' جو لڑکے لڑکیاں اسے پڑھیں گے وہ ساتھ ساتھ اردو زبان بھی سیکھتے جائیں گے۔"

[از: پیش لفظ]

۲۷؍جون ۱۹۴۵ء کی یہ دریابادی تقریظ و شہادت غیر معمولی اہمیت کی حامل شہادت و اعتراف ہے، ۷۴، ۷۵ سال کے اس عرصہ میں کتنی نسلوں کا اس سلسلۂ قصص الانبیاء نے ایمان بنایا، یقین بنایا، عمل نکھارا، اور بچوں اور بچیوں کو صاحب ایمان ویقین بنایا، جس کے برصغیر میں ان گنت ایڈیشن شائع ہوکر خوب عام ہو چکے ہیں، ضرورت ہے کہ ایک مشن کے طور پر مزید اس کی اشاعت و احیاء کا کام اردو داں طبقہ میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا کیا جائے اور اس کو دوسری زبانوں میں بھی منتقل کیا جائے۔

مولانا دریابادیؒ بہت خوب لکھتے ہیں کہ:

"مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی کتاب "قصص النبیین للأطفال" اب نہ کسی تعریف کی محتاج ہے، نہ تعارف کی، سلیس شستہ عربی میں پیغمبروں کے سچے سبق آموز، پُر ہدایت حالات، لڑکوں اور بوڑھوں سب کے پڑھنے کے قابل، ان کی بہن صاحبہ نے یہ کیا کہ انہیں مطالب کو عربی سے اردو میں منتقل کر دیا ہے۔ اور افادہ کا جو حلقہ پہلے بھی ماشاء اللہ اچھا خاصا وسیع تھا اسے اب وسیع تر کر دیا ہے۔

قصص النبیین اصلاً عربی کی مبتدی طلباء کے لیے خاص تعلیمی نقطہ نظر سے لکھی گئی، اور سرسری نظر سے دیکھئے تو صرف درسی اور تعلیمی

کتاب معلوم ہوگی لیکن حقیقتاً علم کلام کی کتاب ہے، ایمان کے مسائل، توحید کے دلائل جس حسن لطافت سے اس کے اندر جمع کر دیے گئے ہیں وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔ ادھر زبان، مربی کے اسلوب بیان کے اصول سمجھتی گئی، ادھر قلب، ایمان، اور قرآن کے حقائق سے منور ہوتا گیا، دماغ نے نشو ونمایائی، روح نے بھی بالیدگی محسوس کی۔''

[از: مقدمۂ کتاب]

ان کی یہ بات بھی زریں حروف سے ذہن و قلب میں لکھنے کی ہے کہ:

''فلسفۂ یونان اور معقولات کسی زمانہ میں اسلام کے دشمن ہوں گے، آج تو اسلام کے پہلوان کو سب سے زیادہ مقابلہ تاریخ اور جغرافیہ اور معاشیات وسیاسیات کے میدانوں میں کرنا ہوگا۔''

[مقدمۂ کتاب]

قصص الانبیاء اور ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سیٹ جوان کا تیار کردہ ہے، مگر اسلوب اور طرز تقدیم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا انہوں نے اختیار کیا ہے، وہ اس کی مصنفہ تھیں۔ جیسا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے ان کی وفات پر اپنی خود نوشت سوانح حیات کاروان زندگی میں تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''ہمارے حضورؐ، بچوں کی قصص الانبیاء اور کئی مفید رسائل وکتابچوں کی مصنف تھیں''۔

[ج۲/ص۱۹۷]

راقم نے امۃ اللہ تسنیم مرحومہ کی سوانح حیات ''عائشہ بی'' (جوان کی گھریلو عرفیت اور نام تھا) لکھنے کا شرف حاصل کیا تو اس میں آٹھواں باب ان کی تصنیفی اور دعوتی خدمات سے متعلق رکھا: جس میں ''قصص الانبیاء'' کے تعلق چند سطریں اس طرح ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی پر بڑے دلچسپ و دل نشیں پیرایہ بیان میں مختصر مگر جامع کتاب ''ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم'' کے نام سے لکھی۔ دیگر انبیاء حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ہود علیہ السلام، حضرت صالح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت شعیب علیہ السلام، حضرت یونس علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سیرت و حالات پر اپنے بھائی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی کتاب قصص النبیین (عربی کی روشنی میں) چار حصوں میں لکھی، یہ بھی بہت مقبول ہوئی، اور مدارس کے نصاب میں داخل ہے، حضرت لوط علیہ السلام کا تذکرہ قصص النبیین میں نہیں تھا جو کہ ''قصص الانبیاء'' میں شامل ہے۔

[عائشہ بی/ص۱۵۰]

آگے ان کی کتاب ''بچوں کے لیے قصص الانبیاء'' کے چند ایسے نمونے پیش کیے جا رہے ہیں جس سے بچوں کے لیے اس کتاب کی غیر معمولی تاثر اور دلچسپی کے اسباب کو سمجھا جا سکے، پہلا قصہ ابوالبشر وابوالانبیاء والرسل سیدنا آدم علیہ السلام کا ہے، جس کا آغاز بڑے خوبصورت انداز میں اس طرح کیا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں آسمان و زمین کو قائم کیا، پھر آسمان کو سورج، چاند، تاروں سے رونق بخشی، زمین میں پہاڑ قائم کیے، بڑے بڑے سمندر بنائے، تالاب اور چشمے نکالے، آسمان سے پانی برسا کر مردہ زمین میں جان ڈالی، پھر اس میں پیڑ پتے، گل بوٹے اگائے، طرح طرح کے پھل، رنگ رنگ کے پھول، مختلف قسم کی پتیاں، مختلف قسم کی خوشبو، سب کا رنگ الگ الگ، سب کی بو جدا جدا، لیکن اللہ تعالیٰ کی یہ وسیع زمین، یہ نئی دنیا انسان سے خالی پڑی تھی، روئے زمین پر کسی انسان کا کوئی پتلہ بھی نظر نہ آتا تھا، نہ یہ مکانات تھے نہ باغات، نہ محل و محلے، نہ آدم نہ آدم زاد''۔

پیدائش آدم کو اس طرح بیان کرتی ہیں:

''اللہ تعالیٰ نے پانی اور مٹی سے ایک پاکیزہ صورت تیار کی، اس میں اپنی روح پھونکی، اور اس کا آدم نام رکھا، پھر ان کو تمام چیزوں کے نام بتائے، کھیتی، باڑی درختوں اور پھلوں کی قسمیں بتائیں، ترکاری اور غلہ کے نام سکھائے، پتھر اور لوہے کی خاصیتیں بتائیں، غرض کہ جس جس چیز کی انسان کو زندگی میں ضرورتیں پیش آتی رہتی ہیں، سب کے نام اور سب کی صفتوں سے آگاہ کیا''۔

[ج۱/ص۲۰]

اچھائی کا شوق اور برائی سے نفرت لذت آدم علیہ السلام کے بیٹے ہابیل کے واقعۂ شہادت سے اس طرح دل میں بٹھائی ہیں:

''جب اللہ کا ڈر دل سے نکل جاتا ہے، اور خواہشات نفسانی بڑھ جاتی ہے تو پھر اچھے بُرے کی تمیز اور عذاب وثواب کی فکر دل سے محو ہو جاتی ہے۔''

[ص۳۶]

آگے کہتی ہیں:

''دنیا میں یہ پہلا قتل تھا جو قابیل کے ہاتھوں ہوا، قابیل نے قتل کی ایجاد کی، بھائی سے دشمنی کی، بنیاد اس نے ڈالی۔ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جس نے ہمارے دین میں خیر کی کوئی بات ایجاد کی تو جتنا ثواب کار خیر کرنے والے کو ملے گا اتنا ہی ایجاد کرنے والے کو ہوگا، اور کرنے والے کے ثواب میں کوئی کمی نہ ہوگی، اور جس نے ہمارے دین میں کسی بری بات کی بنیاد قائم کی تو جتنا گناہ کرنے والے کو گناہ ہوگا، اتنا ہی نکالنے والے کو ہوگا،......

............بقیہ صفحہ ۳۲ پر

رفتارِ زمانہ

بٹ کوائن میں مصنوعی قیمت کیسے پیدا کی گئی؟

ڈاکٹر مبشر حسین رحمانی (آئرلینڈ)

بٹ کوائن کو اگر ہم تاریخی طور پر دیکھیں تو یکم نومبر سن ۲۰۰۸ء کو ساتوشی ناکاموٹو (ایک فرضی نام) نے کرپٹوگرافی میلنگ لسٹ پر ایک ای میل بھیجی جس میں اس نے اس بات کا اظہار کیا کہ وہ ایک ایسے الیکٹرونکس کیش سسٹم پر کام کر رہا ہے جو کہ مکمل طور پر پی ٹو پی Peer-to-Peer (P2P) ہوگا اور جس میں کسی ٹرسٹڈ تھرڈ پارٹی Trusted Third Party کا کوئی عمل دخل نہیں ہوگا یعنی بیچ میں کوئی ادارہ ملوث نہیں ہوگا۔ پھر سن ۲۰۰۹ء میں ساتوشی ناکاموٹو نے بٹ کوائن Bitcoin (BTC) نامی کرپٹو کرنسی Cryptocurrency کو مارکیٹ میں لانچ کر دیا۔ ساتوشی ناکاموٹو' بٹ کوائن وائٹ پیپر میں دعویٰ کرتا ہے کہ بٹ کوائن ایک ایسی کرپٹو کرنسی ہے جو کہ ڈی سینٹرلائزڈ ہے اور اس کو کام کرنے کے لیے کسی تھرڈ پارٹی کی ضرورت نہیں ہے یعنی کسی بینک یا کسی دوسرے فنانشل ادارے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی تناظر میں ۳ر جنوری سن ۲۰۰۹ء میں سب سے پہلا بلاک بٹ کوائن بلاک چین میں شامل کیا گیا۔ یعنی آسان الفاظ میں اس دن بٹ کوائن کرپٹو کرنسی کی شروعات ہوئی۔ اس دن ساتوشی ناکاموٹو نے جینیسس بلاک Genesis Block مائن کیا۔ اس پہلے بلاک میں ایک ٹرانزیکشن شامل کی گئی اور وہ کوائن بیس ٹرانزیکشن CoinBase Transaction تھی یعنی اس پہلے بلاک کو مائن کرنے کے معاوضہ کے طور پر ۵۰ بٹ کوائن کا پہلی مرتبہ بٹ کوائن کھاتے میں اندراج ہوا۔

یہاں پر بنیادی بات سمجھنے کی ہے کہ جس دن بٹ کوائن کا کھاتے میں اندراج ہوا، اس بلاک کے ہیش کو ہم بٹ کوائن نہیں کہہ سکتے۔ نیز جس ایڈریس پر بیس کوائن ٹرانزیکشن مائننگ کے معاوضہ کے طور پر ادا کی گئی وہ بھی بٹ کوائن نہیں ہیں۔ نیز جو ۵۰ بٹ کوائن کا کھاتے میں اندراج ہوا، وہ محض ایک فرضی نمبر ہیں اور ان نمبروں کی ڈیجیٹل فارم کو بھی ہم بٹ کوائن نہیں کہہ سکتے۔ بعض لوگوں کو کمپیوٹر سائنس کا علم نہ ہونے کی وجہ سے یہیں پر مغالطہ ہوا ہے اور انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ کھاتے میں اندراج کیے گئے ۵۰ بٹ کوائن اصل میں موجود ہیں، حالانکہ یہ محض فرضی ۵۰ نمبروں کا کھاتے میں اندراج تھا۔ دیکھیے یہ جو بٹ کوائن کا کھاتے میں اندراج ہو رہا ہے اور پھر آگے چل کر ایک دوسرے کو منتقلی ہو رہی ہے اور ان تمام معاملات کا اندراج کھاتے میں ہو رہا ہے، اس تمام عمل کو بٹ کوائن کے معاملات کا اندراج تو کہا جا سکتا ہے مگر یہ بذاتِ خود بٹ کوائن نہیں۔ آسان الفاظ میں بٹ کوائن کرپٹو کرنسی کے معاملات کے کھاتے میں اندراج کو بٹ کوائن کرنسی کی حقیقت نہیں کہا جا سکتا۔ اسی وجہ سے جب بٹ کوائن کی شروعات کی گئی تو کھاتے میں درج ان مصنوعی نمبروں کی کوئی قیمت نہیں تھی اور پھر آگے چل کر کچھ لوگوں نے مصنوعی طور پر اس میں قیمت پیدا کی۔

اس کو ایک آسان مثال سے سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے یہ خیال ذہن میں لاتا ہے کہ کاش اس کی بھی کوئی بڑی ہاؤسنگ سوسائٹی ہوتی اور اس کے پلاٹوں کو بیچ کر وہ پیسے کماتا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے ہی اس نے سوچا کہ شہر کی سپر ہائی وے پر اس نے زمین خرید لی، پھر خیالی طور پر اس نے ابتدائی سرمایہ کاری کر کے اس تک بجلی، گیس، سڑکیں اور دیگر عوامی سہولیات یکجا کر لیں۔ پھر اس نے خیالی طور پر اس سوسائٹی کی زمین پر سو گز کے پچاس، دوسو گز کے پچاس اور ہزار گز کے بیس پلاٹ بنائے اور پھر ان پلاٹوں کو نمبر بھی خیالی طور پر الاٹ کر دیا۔ سو گز کے پلاٹوں کی نمبرنگ A1-A to 50، دو سو گز کے پلاٹوں کی نمبرنگ B 1-B to 50، اور ہزار گز کے پلاٹوں کی نمبرنگ C1-C to 20 تک اپنے ذہن میں فرضی طور پر کر لی۔ پھر اس نے ان پلاٹوں کے نمبروں کے مطابق کھاتے (بلاک چین) میں اندراج کر دیا اور لوگوں کو کہا کہ آئیے آپ ان پلاٹوں کو خریدیے اور سو گز کے ہر پلاٹ کی قیمت دس لاکھ، دو سو گز کے ہر پلاٹ کی قیمت بیس لاکھ اور ہزار گز کے پلاٹ کی قیمت پچاس لاکھ رکھی۔ پھر ویب سائٹ اور اشتہارات کے ذریعے اس فرضی سوسائٹی کی مشہوری کروائی۔ شروع میں تو ان فرضی پلاٹوں کی قیمت کو کسی نے تسلیم نہیں کیا مگر پھر آہستہ آہستہ مصنوعی طور پر اس کی قیمت بڑھائی گئی اور آخر کار مصنوعی قیمت اس کے اختراعی قیمت کے برابر لوگوں میں مشہور ہو گئی اور لوگوں نے اس قیمت کو تسلیم بھی کر لیا۔ پھر لوگوں نے ان پلاٹوں کو خریدنا شروع کر دیا اور پھر ہر خریداری کے وقت کھاتے (بلاک چین) میں اُس خریدار کا نام اور اس کا پلاٹ نمبر درج کر دیا گیا۔ پھر لوگوں نے آگے ان پلاٹوں کو بیچنا شروع کر دیا اور اس طریقے سے ایک

پورا پلاٹوں کا کاروبار شروع ہوگیا اور کچھ لوگوں نے اس سے بہت زیادہ منافع بھی کمایا۔

انھی پلاٹوں کو خریدنے والے ایک خریدار نے سوچا کہ چلو میں اپنے خریدے گئے پلاٹ پر تعمیر شروع کرتا ہوں اور اپنی فیملی کو اس نئی ہاؤسنگ سوسائٹی میں شفٹ کرتا ہوں۔ تو اس پر یہ عقدہ کھلتا ہے کہ اصل میں تو پلاٹ سرے سے موجود ہی نہیں! مزید تحقیق کرتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ایک فرضی ہاؤسنگ سوسائٹی کا بلاک چین پر پروجیکٹ شروع کیا گیا، فرضی نمبر الاٹ کیے گئے، مصنوعی طور پر اس میں قیمت پیدا کی گئی اور پھر خرید وفروخت کا اندراج بلاک چین (کھاتے) میں کیا گیا۔ قارئین، آپ ہی بتائیے کہ کیا یہ فراڈ نہیں؟ اب کوئی دلیل دینے والا دلیل دے کہ دیکھیے ٹرانزیکشن ہو رہا ہے کہ نہیں، تو کیا آپ اس کو تسلیم کریں گے؟ کوئی یہ دلیل دے کہ دیکھیے پلاٹ کا پورا پورا اندراج کھاتے میں موجود ہے، تو کیا آپ اس کو مانیں گے؟ کوئی یہ دلیل دے کہ دیکھیے یہ ڈیجیٹل شکل میں تو موجود ہے اور لوگ اس کو عرف میں تسلیم بھی کر رہے ہیں تو کیا آپ اس دلیل کو مانیں گے؟

کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ دیکھیے پلاٹ کی صورت میں یہ فراڈ اس وجہ سے ہے کہ اس میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ حقیقت میں پلاٹ حسّی طور پر موجود ہیں، مگر وہ پلاٹ حقیقت میں موجود نہیں تھے اور محض کمپیوٹر پر اندراج تھا۔ البتہ کرپٹو کرنسی کے تناظر میں شروع سے ہی اس کی حقیقت عوام کو بتادی گئی تھی کہ کوئی حسّی شے موجود نہیں ہوگی اور یہ کرنسی، ڈیجیٹل کرنسی ہوگی لہذا پلاٹ کی صورت میں فراڈ کو کرپٹو کرنسی پر محمول کرکے فراڈ قرار دینا منطقی نہیں لگتا۔ بس، یہیں پر تو فراڈ ہو رہا ہے کہ اب بجائے فرضی پلاٹوں کے، کوئی شخص کرنسی کو تصوّر ذہن میں لائے، پھر ذہن میں فرضی طور پر اس کرنسی کے بارے میں سوچے اور پھر کھاتے میں اس فرضی کرنسی کے نمبروں کا اندراج کرے اور پھر مصنوعی طور پر اس میں قیمت پیدا کی جائے، تو کیا یہ فراڈ نہیں؟ یہ یقیناً فراڈ ہی کی ایک اعلیٰ قسم ہے اور نتیجتاً اس وقت عالمی سطح پر بے تحاشہ پونزی اسکیموں کے ذریعے لوگوں نے فرضی کرنسیاں مارکیٹ میں متعارف کروائیں، ان سے پیسہ بنایا اور پھر مارکیٹ سے پیسہ لے کر غائب ہوگئے۔ فرضی ہاؤسنگ سوسائٹی کی صورت میں فراڈ کرنے کیلئے بڑی محنت درکار تھی مگر کرپٹو کرنسی کی صورت میں فراڈ کرنا آسان کردیا اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت مارکیٹ میں ہزاروں کی کرپٹو کرنسیاں موجود ہیں۔ کرپٹو کرنسی کے تناظر میں اس فراڈ کو بڑے نفیس طریقے سے کیا جاتا ہے اور اس میں کمپیوٹر سائنس کی مشکل اصطلاحات کا استعمال مثلاً کرپٹوگرافک پزل، ہیشنگ، بلاک، ڈیفیکلٹی، پبلک پرائیوٹ کی، کرپٹوگرافی، مائننگ وغیرہ کا استعمال کرکے اور اس کی عالمی پیمانے پر نشر واشاعت اور پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے لہذا یہ فراڈ اور قماربازی کی خطرناک نئی شکل بن جاتی ہے اور یہی کچھ تو بٹ کوائن میں ہو رہا ہے۔ خیر ہم واپس اپنے اصل موضوع یعنی بٹ کوائن میں مصنوعی قیمت کیسے پیدا کی گئی کی طرف آتے ہیں۔

بٹ کوائن کھاتے کی شروعات کے کچھ دنوں بعد یعنی ۱۲؍جنوری سن ۲۰۰۹ء کو بٹ کوائن کرپٹو کرنسی کی پہلی باقاعدہ ٹرانزیکشن بلاک نمبر ۱۷۰ میں اندراج ہوئی اور اس ٹرانزیکشن میں ساتوشی ناکاموٹو نے کمپیوٹر پروگرامر ہال فنی Hal Finney کو دس بٹ کوائن بھیجے۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا اور بٹ کوائن کھاتے کی شروعات کے بعد وقتاً فوقتاً مختلف ایڈریس کے ذریعے سے مختلف ٹرانزیکشنز کی گئیں، اور بہت زیادہ تعداد میں بٹ کوائن کرپٹو کرنسی تخلیق (مائن) کی گئی اور پھر مختلف ٹرانزیکشنز کے ذریعیان بٹ کوائن کا باہمی تبادلہ بھی کیا گیا۔

۵؍اکتوبر ۲۰۰۹ء میں نیو لبرٹی اسٹینڈرڈ نے بٹ کوائن کے پہلے ایکسچینج ریٹ متعین کیے یعنی ایک بٹ کوائن صفر اعشاریہ صفر صفر سات چھ امریکی ڈالر کے برابر متعین ہوا BTC 1 = USD0.00076 یا اس کو کہہ سکتے ہیں کہ ایک امریکی ڈالر سے ایک ہزار تین سو نو اعشاریہ صفر تین بٹ کوائن 1 USD = 1309.03BTC خریدے جاسکتے تھے۔ بٹ کوائن کا ایکسچینج ریٹ تو متعین ہوگیا مگر ان بٹ کوائن سے سب سے پہلی مرتبہ حقیقی اشیاء کی خریداری سن ۲۰۱۰ء میں ہوئی جب پہلی مرتبہ دس ہزار بٹ کوائن کی مدد سے دو پیزا خریدے گئے جس کی آج کی مالیت کروڑوں روپے سے بھی زیادہ بنتی ہے اور اسی مناسبت سے بٹ کوائن پیزا کا دن بھی منایا جاتا ہے۔ اسی طریقے سے اور لوگوں نے بھی بٹ کوائن کرپٹو کرنسی سے چیزوں کو خریدنے کی کوشش کی اور بٹ کوائن کرپٹو کرنسی کی خرید و فروخت کے لیے ایکسچینج بھی قائم کیا گیا۔ ۱۷؍جولائی سن ۲۰۱۰ء کو ایم ٹی گوکس MtGox نامی بٹ کوائن کرپٹو کرنسی ایکسچینج وجود میں آیا۔ اکتوبر سن ۲۰۱۰ء میں ایف اے ٹی ایف نے رپورٹ جاری کی جس میں وارننگ جاری کی گئی کہ ڈیجیٹل کرنسیوں کو منی لانڈرنگ اور دہشت گردوں کی معاونت کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ پھر ۹؍فروری ۲۰۱۱ء کو ایک بٹ کوائن کی قیمت ایک امریکی ڈالر کے برابر ہوئی۔ شروع کے دو سالوں میں بٹ کوائن کی تمام دولت پر محض ۶۴؍لوگوں کا قبضہ تھا۔ یعنی بٹ کوائن لانچ ہونے سے لے کر بٹ کوائن کی قیمت ایک امریکی ڈالر ہونے تک، یعنی تقریباً دو سال کا عرصہ، چونسٹھ لوگ وہ ہیں جنہوں نے زیادہ تر بٹ کوائن کو مائن کیا۔

خلاصہ یہ کہ سب سے پہلے فرضی نمبروں کا کھاتے میں اندراج کیا گیا، پھر کوشش کی گئی کہ ان

فرضی نمبروں سے کچھ خریداری کی جائے اور بالآخر ان فرضی ہندسوں کے ذریعے پہلی خریداری پیزا کی شکل میں ہوئی یعنی ان فرضی ہندسوں میں فرضی طور پر تقوّم پیدا کیا گیا ہے۔ اگر آپ مزید گہرائی میں تفصیلات جاننا چاہتے ہیں کہ کس طریقے سے بٹ کوائن کے اندر مصنوعی طور پر تقوّم پیدا کیا گیا اور کس طریقے سے کوششیں کر کے مختلف اشیاء کی خرید وفروخت بٹ کوائن کے ذریعے کرنے کی کوشش کی گئی، اس کیلئے ہسٹری آف بٹ کوائن (/historyofbitcoin.org//:http) کی ویب سائٹ اور دیگر سائنسی مقالے دیکھیے۔

بٹ کوائن کیان فرضی ہندسوں میں فرضی طور پر تقوّم پیدا کرنے کی تفصیلات جاننے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بٹ کوائن کو عوام میں مشہور کیسے کیا گیا؟ سائنسی شواہد یہ بات ثابت کرتے ہیں کہ دنیا کی سب سے بڑی کرپٹو کرنسی یعنی بٹ کوائن کو جوے کی مدد سے مزید مشہور کیا گیا۔ مختصراً یہ کہ بٹ کوائن کو مارکیٹ میں لانچ کرنے کے بعد پہلے کچھ سالوں کے اندر لوگوں نے زیادہ جوش وخروش نہیں دکھایا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ شروع کے پہلے سالوں میں بہت ہی کم ٹرانزیکشنز ہوئیں۔ پھر ایک جوے کی ویب سائٹ ساتوشی ڈائس DiceSatoshi لانچ کی گئی جس کے ذریعے لوگوں کو بٹ کوائن کے بارے میں مزید معلوم ہوا اور انہوں نے بڑھ چڑھ کر بٹ کوائن کو جوے میں استعمال کرنا شروع کیا۔ ساتوشی ڈائس نامی ویب سائٹ نے لوگوں کو ان کی توقع سے زیادہ جوے کی رقم لوٹائی جس کے اندر دس گنا، سو گنا اور ہزار گنا سے زیادہ نفع شامل تھا۔ مثلاً کسی نے ۵ بٹ کوائن اس ساتوشی ڈائس نامی ویب سائٹ پر جوے میں لگائے یعنی ویب سائٹ پر دیے گئے ایڈریس پر بھیجے تو جوے میں جیتنے کی صورت میں اس کو ۵۰، ۵۰۰، یا ۵۰۰۰ بٹ کوائن ملے۔ جون سن ۲۰۱۲ء کے اندر ایک ایسا وقت بھی آیا جب روزانہ کے حساب سے ساٹھ ہزار سے زیادہ ٹرانزیکشن ہوئیں اور ان کو بٹ کوائن کی بلاک چین کا حصہ بنایا گیا اور پھر لوگوں نے اس کے بارے میں جانا۔ بٹ کوائن کا اگر ہم اس دور میں جائزہ لیں تو زیادہ تر ٹرانزیکشن جوے سے ہی متعلق تھیں اور بٹ کوائن کا وسیع استعمال جوے کے اندر کیا گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ نکلا کہ لوگوں نے عالمی سطح پر بٹ کوائن کے اندر زیادہ دلچسپی لینا شروع کی اور چونکہ بٹ کوائن کا کوڈ مفت میں ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے، اس وجہ سے لوگوں نے اس کوڈ کو لے کر اس کی بنیاد پر دیگر کرپٹو کرنسیوں کی بھی بنیاد رکھی۔

اصل میں تو بٹ کوائن کی ذاتی قدر Intrinsic Value نہیں ہے اور کسی سافٹ ویئر کی طرح اس سے ذاتی انتفاع بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ بٹ کوائن حسّی طور پر تو درکنار، ڈیجیٹل طور پر بھی اپنا وجود نہیں رکھتی اور یہ محض ایک فرضی یا تصوراتی نمبر ہیں یا آسان الفاظ میں کھاتے کے اندر محض ایک نمبر کا اندراج ہے۔ مثلاً جب ایک شخص زید دوسرے شخص بکر کو بٹ کوائن بھیجتا ہے تو صرف کھاتے Ledger کے اندر اندراج ہوجاتا ہے اور حقیقی طور پر یا ڈیجیٹل طور پر بٹ کوائن دوسرے شخص بکر کو منتقل نہیں ہوتے۔ بٹ کوائن کی محض ملکیت ثابت کرنے کے لیے اور ایک شخص سے دوسرے شخص کو بٹ کوائن منتقل کرنے کیلئے ٹرانزیکشن کا اندراج کھاتے کے اندر کیا جاتا ہے۔ اور کوئی بھی شخص مکمل کھاتے کی چھان بین کر کے یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ کتنے بٹ کوائن کس کی ملکیت میں ہیں اور یہ وہ باآسانی یو ٹی ایکس او Unspent UTXO-Transaction Output اور ایس ٹی ایکس او Spent -Transaction Output STXO کی مدد سے کرسکتا ہے۔

تمام سائنسدان اس بات پر متفق ہیں کہ بٹ کوائن پروٹوکول میں کوائن موجود نہیں ہوتے، صرف ٹرانزیکشنز ہوتی ہیں، جس کے ذریعے سے ملکیت کا تعین کیا جاتا ہے۔ چونکہ بٹ کوائن میں کوائن موجود نہیں ہوتے لہٰذا ان کوائن کے سیریل نمبر بھی نہیں ہوتے۔ ٹرانزیکشن ہیش اور پچھلی ٹرانزیکشن کے حوالے کو ہی سیریل نمبر کے طور پر لیا جاتا ہے۔ عام کرنسی نوٹوں میں سیریل نمبر ہوتا ہے جس کی ضرورت بٹ کوائن سے ختم کردی گئی ہے۔ اگر ہم کرپٹو کرنسی کی ماہیت پر غور کریں تو یہ بات سائنسی طور پر مسلم کہ کرپٹو کرنسی معدوم ہوتی ہے یعنی یہ محض لیجر میں فرضی نمبروں کا اندراج ہے۔ نیز چونکہ کرپٹو کرنسی سے ذاتی انتفاع حاصل نہیں کیا جاسکتا اور اس میں ذاتی قدر بھی نہیں تھی لہٰذا ان فرضی ہندسوں میں فرضی طور پر تقوّم پیدا کیا گیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کرپٹو کرنسی کا کاروبار محض فرضی ہندسوں کا گورکھ دھندہ ہے، جوے اور سٹے بازی کی بدترین شکل ہے اور اس کے ذریعے سے ترقی پذیر ممالک کی معیشت کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور اس پر محض چند لوگوں یا اداروں کی اجارہ داری ہے۔ ہمیں بحیثیتِ مسلمان اپنی دین اور دنیا دونوں کو بچانا ہے اور ہمیں پوری کوشش کرنی چاہیے کہ کرپٹو کرنسی میں ہر طرح کے معاملات سے اجتناب کریں اور جمہور مفتیانِ کرام کی رائے پر چلتے ہوئے اس سے لازمی بچیں۔

☆☆☆☆☆

رسید کتب

تعارف وتبصرہ

محمد اصطفاء الحسن کاندھلوی ندوی

نام کتاب: **انوارِ قرآنی**

افادات: مولانا ڈاکٹر سعید الرحمان اعظمی ندوی

راقمِ سطور نے جن اکابر کو دیکھا ہے کہ قرآن سے خاص شغف رکھتے ہیں' ان میں استاد گرامی قدر مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت فیوضھم کی شخصیت بھی ہے۔ ہمیشہ آپ کو نہایت اہتمام اور پابندی سے تلاوتِ قرآن کریم میں خاص طور پر جامع ندوۃ العلماء میں مشغول دیکھا، آپ کی تلاوت ایسی ہوتی ہے کہ جیسے کوئی اس میں غرق ہو جائے اور اسے اردگرد کا ہوش نہ رہے۔ آپ چونکہ عالمانہ شان رکھنے کے ساتھ عربی زبان کے ادیب و رمز شناس بھی ہیں، اس لیے ذوقِ تلاوت آپ جیسی شخصیات کو نہ حاصل ہو تو کس کو حاصل ہو۔

حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم اردو و عربی زبان میں صحافت اسلامی کے علم برداروں میں شمار ہوتے ہیں، اس میدان میں آپ اپنا ایک خاص اسلوب و مقام رکھتے ہیں اور آپ کی وقیع تصنیفات و مضامین زیادہ تر ادب و صحافت ہی کے موضوع سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہم دار العلوم ندوۃ العلماء کے نوجوان استاد محمد سلمان بجنوری ندوی کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے کچھ عرصہ قبل حضرت کے حدیثی افادات 'خمسون حديثاً' کے عنوان سے مرتب کیے، اور اب 'انوارِ قرآنی' کے نام سے تفسیری افادات بھی سامنے لا چکے ہیں۔

موصوف کو یہ سعادت حاصل رہی ہے کہ وہ حضرت کے ساتھ کافی وقت دفتر اہتمام، دفتر البعث اور دولت کدہ پر گذارتے ہیں، یہ ان کی مزید سعادت مندی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو توفیق دی کہ وہ اس دوران حضرت کے افادات کو قلم بند کر کے حسنِ ترتیب کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کر سکے۔

انوارِ قرآنی میں قاری کو مختلف قرآنی موضوعات پر وقیع معلومات افزا اور ایمان افروز کلام پڑھنے کو ملتا ہے، خاص طور پر تعبیر کی نکتہ سنجیاں اور لغوی عقدہ کشائیاں جو سوا دو سو صفحات پر مشتمل خوبصورت طباعت سے آراستہ اس کتاب میں ہیں' وہ اسی کا خاصہ ہیں۔

'البلاغ پبلیکیشنز' لکھنؤ سے شائع ہو کر ندوہ کیمپس اور باہر کے کتب خانوں پر دستیاب ہے۔

رابطہ کے لیے: ۸۰۹۰۲۶۳۴۶۸

نام کتاب: **میرے مربی میرے محسن**

تالیف: سراج الدین ندوی

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ایک ایسی عظیم اور مختلف الجہات شخصیت تھی کہ ان کے احوال و کوائف، اوصاف و کمالات، افکار و نظریات اور امت پر ان کے احسانات کی داستان جتنی بار لکھی جائے اور پڑھی جائے تشنگی نہیں جاتی۔ زیرِ نظر تالیف "میرے مربی میرے محسن - مفکر اسلام مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ" مولانا سراج الدین ندوی کی کاوش ہے، جن کا شمار نہ صرف یہ کہ مفکر اسلام کے ممتاز تربیت یافتگان میں ہوتا ہے؛ بلکہ وہ اپنی تحریروں، بیسیوں تالیفات، اور معروف اردو ماہنامہ "اچھا ساتھی" کے ریاستِ تحریر کی وجہ سے مفکرِ اسلامؒ کے ایک قابلِ قدر و احترام فیض یافتگان میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔

موصوف محترم کی یہ تالیف اپنے اندازِ پیش کش میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت پر تحریر کی جانے والی دیگر کتابوں سے کچھ منفرد نظر آتی ہے؛ در اصل یہ ایک انڈکس کے طرز پر لکھی گئی ہے، جس کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے؛ ابتدا میں 'عرضِ ناشر' کے بعد مرشد الامۃ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور علمبردارِ صحافتِ اسلامی مولانا سید محمد واضح رشید ندوی رحمہما اللہ کے خوبصورت مقدموں سے کتاب کا آغاز ہوتا ہے، 'پیش لفظ' کے بعد "حضرت مولانا علی میاںؒ - ایک جامع شخصیت"، "گھریلو حالات"، "ملکی حالات"، "عالمی حالات"، "تعلیم و تربیت"، "مختصر سوانح عمری"، "اخلاق و اوصاف"، "عادات و معمولات"، "ملفوظات"، "مناصب"، "ایوارڈ و اعزازات"، "چند واقعات زندگانی خود مولانا کی زبانی" اور "حضرت مولاناؒ کے پسندیدہ اشعار" جیسے عناوین کے ساتھ مفکرِ اسلامؒ کا ایک شخصیتی خاکہ جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد "خدمات و کارنامے"، "حضرت مولانا کی کوششیں"، "حضرت مولانا کا پیغام"، "عظیم (علمی و سیاسی، ملکی و غیر ملکی) شخصیات (سے ربط و خطاب)" ذکر نے کے بعد سب سے آخر میں "منظوم خراجِ عقیدت" کے تحت بیسیوں شعراء کا منظوم کلام پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح ۲۷۰ر کے قریب کتابی سائز کے صفحات پر مشتمل یہ تالیف حضرت مفکرِ اسلام رحمۃ اللہ

علیہ کی شخصیت و زندگی کا تعارف پیش کرنے ’دریا بکوزہ‘ کی حیثیت رکھتی ہے۔

گرچہ ’مولانا ابوالحسن علی ندوی اسلامک اکیڈمی بھٹکل‘ سے کافی عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہے، اور مرشد الامۃ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے دستِ مبارک سے وہیں اس کا رسمِ اجرا بھی ہو چکا ہے، تاہم ’تعمیرِ حیات‘ میں ’تعارف و تبصرہ‘ کی ڈیسک تک حال ہی میں پہونچی ہے، حصول و مطالعہ کے لیے لکھنؤ، دہلی، بجنور اور حیدرآباد کے کتب خانوں سے طلب کیا جاسکتا ہے۔

رابطہ کے لیے: ۹۷۵۸۲۱۹۱۷۵

نام کتاب: **پیامِ حاضر** (شعری مجموعہ)

تالیف: شاہی ارریاوی

نفیس کتابت، نفیس قرطاس، نفیس طباعت سے مزین، اور نفیس کلام پر مشتمل ایک شعری مجموعہ موسوم بہ ’’پیامِ حاضر‘‘ نگاہوں کے سامنے ہے، یہ اک نوخیز شاعر دارالعلوم دیوبند کے ہونہار طالبعلم ابوامامہ شاہی ارریاوی کا نتیجۂ فکر ہے، جو ’شاہی‘ تخلص کرتے ہیں، اور قلمی نام ’شاہی ارریاوی‘ رکھتے ہیں۔

’’پیامِ حاضر‘‘ کا شاعر اپنی نوعمری کے باوجود منجھے ہوئے خیالات کا مالک ہے، جو شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کے اسلوب سے کافی حد تک متاثر معلوم ہوتا ہے، اس نے اپنی خداداد صلاحیت اور قدرت کی عطا کردہ طبیعت و مزاج سے علامہ کے اسلوب، فکر، احساس اور جذبات و نظریات سے اپنی شاعری کو خوب سینچا ہے، اور اس کے رنگ میں رنگنے کی قابلِ قدر کوشش کی ہے۔

’’پیامِ حاضر‘‘ کا شاعر علامہ کی شاعری سے اتنا متاثر ہے کہ نہ صرف اسلوب اور لب ولہجہ میں ان کی مماثلت رکھتا ہے؛ بلکہ شاعری کی غرض و غایت، اور بحور و قوافی میں بھی علامہ کی نظموں کا رنگ اس کے کلام میں خاصا جھلکتا ہے؛ چند بحریں اور قافیے اور ساتھ اسلوبِ تخاطب ملاحظہ کریں:

خمیرِ زاغ و کرگس سے تنِ شہباز پیدا کر
صفوں میں اپنے پیارے! بے خطر جانباز پیدا کر
نظامِ مے کدہ پابندِ دستورِ کہن کب تک؟!!
نیا ہے دور اے ساقی! نیا انداز پیدا کر

اور یہ:

جو جل کر راکھ ہو جائے ترے شعلوں کی گرمی سے
کہ شعلہ بار چنگاری ہو، کر آہِ سحر پیدا
جہانِ رنگ و بو اک دن ترے قدموں میں آئے گا
کیا تو نے تخیل میں اگر فکر و نظر پیدا

بعض نظموں کے عناوین بھی ملاحظہ کریں:

’فتحِ مکہ‘، ’فلسطینی جگر‘، ’پیامِ خالد بن ولید‘، ’خلافت و سیاست‘، ’عشق‘، ’نیا انداز پیدا کر‘، ’پیرزادہ اور شاعر‘، ’غالب و اقبال‘، ’جانشینِ شیخ الہند‘ ’غلامی‘، ’خاکی‘۔ ان عناوین سے کیا یہ محسوس نہیں ہوتا کہ گویا دیوانِ اقبال کی نظموں کے عناوین ہوں؟

اقبال کی طرح قوم و ملت کی عظیم ہستیوں کو بھی شاعر نے موضوعِ سخن بنایا ہے، حضرت مفکرِ اسلامؒ پر چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سید! ہزاروں حسرت دل میں لیے ہوئے ہوں
اے کاش! آپ ہوتے، کیا خوب اپنی بنتی
عزم و جنوں کا پیکر، ہو آپ سا بھی کوئی
اے پاسبانِ ملت، اسلام کے سپاہی

شاہی ارریاوی اک نوجوان ہیں، اور نوجوان برادری ہی درحقیقت ان کی بہ طورِ خاص مخاطَب ہے؛ ایک نظم میں اپنے ہم عمروں سے ایک مناظرہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہونٹوں پہ ہنسی، دل میں یہ رکھتے ہیں کدورت
آرا بھی دیے جاتے ہیں، کرتے ہیں نصیحت
اے نغمہ سرا! ذکرِ حسینہ ہو غزل میں
کہتی ہے مجھے آ کے یہ یاروں کی جماعت
اس دور میں مجنوں کی محبت کے ہیں چرچے
دل شوخ حسینوں سے لگا، چھوڑ حکومت
مے خانہ میں چل اے کہ تجھے رقص دکھاؤں
کیا رسمِ جوانمردی ہے، بے جا ہے شجاعت
اے شاعرِ نوخیز! تجھے فکرِ امم کیوں؟!!
جاتی ہے تو جانے دے اسے، چھوڑ شریعت
یہ کوشش پیہم تری بیکار رہے گی
اب تو ہی بتا ہند میں ممکن ہے خلافت؟

جواب ملاحظہ کریں:

گر حسنِ خیالات کا معیار یہی ہے
تو مجھ کو نہیں ایسے تخیل کی ضرورت
معشوق کی زلفوں میں پلی میری غزل ہو
اس بات کی قائل ہی نہیں میری طبیعت
جن آنکھ کے تاروں میں نہیں اوجِ ثریا
ان شوخ نگاہوں سے نہیں مجھ کو محبت
میں شاہیِ دوراں ہوں، مری شان نرالی
باقی ہے ابھی میری جوانی کی قیامت

ہم اس نوخیز شاعر کو اس خوبصورت مجموعہ کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہیں، اور امید کرتے ہیں کہ وہ اپنی افتادِ طبع، طبیعت کی جولانی اور مشقِ سخن سے جلد ہی اس قابل ہو جائیں گے کہ علامہ کی شاعری کا Latest Version نوجوانانِ امتِ اسلامیہ کے سامنے علامہ کے شایانِ شان پیش کرسکیں، اور عامر عثمانیؒ کے بعد امتِ اسلامیہ کو اک اور شاعر مل جائے، جو اپنے فکر و احساس کی گرمی سے اس کے مردہ و بے حس جسم میں جد و جہد کی روح پھونکنے کی کوشش کرے۔

☆☆☆☆☆

عہد ساز شخصیت

حضرت مفکر اسلام علیہ الرحمہ- ایک عظیم مفکر و قائد

محمد کلام الدین ندوی

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ایک عظیم مفکر، مبلغ، داعی، مصنف، ماہر تعلیم، تاریخ داں اور مقرر دوراں تھے، جن کی تحریر کا ہر پیراگراف ادب کا ایک شہ پارہ اور جن کی تقریر کا ہر ہر جملہ خلوص ومحبت اور امت کے لیے درد و تڑپ کا آئینہ دار تھا، حضرت مولاناؒ ہندوستان کی وہ پہلی شخصیت تھی جن کو عجم سے زیادہ عرب جانتے تھے، حضرت مولاناؒ ہندوستان کے ایک ایسے عالم دین تھے جن کو حج کے موقع پر خانۂ کعبہ کی چابی دی گئی، اور کہا گیا کہ آپ جب چاہیں اور جس کو چاہیں خانۂ کعبہ کے اندر لے جا سکتے ہیں، حضرت مولاناؒ پہلے ایسے عظیم مفکر تھے، جن کو آکسفورڈ اسلامک سینٹر کا ۱۹۸۰ء میں چیئرمین بنایا گیا، حضرت مولاناؒ پہلے ایسے قائد و رہنما تھے، جن کو سارے مسالک اور مذاہب کے لوگ اپنا رہنما مانتے تھے اور سبھی آپ کو اپنی محفلوں میں بلانا فخر محسوس کرتے تھے، حضرت مولاناؒ ہندوستان کے پہلے ایسے خوش اخلاق عالم دین تھے جن سے دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ بھی ملنا اپنے لیے ایک شرف محسوس کرتے تھے، حضرت مولاناؒ کی نصیحتوں کو غور سے سنا کرتے تھے۔

حضرت مولاناؒ نے اردن کے شاہ عبداللہ، شاہ حسین، سعودی عرب کے شاہ سعود، شاہ فیصل، شاہ خالد اور شاہ فہد، مراکش کے کنگ ملک حسن ثانی، شارجہ کے حاکم سلطان بن محمد قاسم، یمن کے صدر علی عبداللہ صالح اور پاکستان کے صدر جنرل ضیاء الحق سے کئی کئی ملاقاتیں کی اور امت کے مسائل ان کے سامنے رکھے، قلم کا یہ سپاہی اتر پردیش کے چھوٹے سے گاؤں دائرۂ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی، جسے گیارہ صدی عیسوی میں شاہ علم اللہ حسنیؒ نے بسایا تھا، حضرت مولاناؒ جب ۲۴ر نومبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے تو اس وقت کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ بچہ نہ صرف یہ کہ اپنے خاندان بلکہ اپنے ملک اپنی قوم اور اپنے دین وملت کا ایسا نام روشن کرے گا کہ صرف عرب وعجم ہی نہیں بلکہ یورپ کے دانش گاہوں میں بھی اس کے علم وفن، تحقیق وتصنیف اور فکر ونظر کی طوطی بولے گی،

حضرت مولاناؒ کے والد ماجد کا نام مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ تھا، جو ایک مشہور مصنف اور عالم دین تھے، ۵ر ہزار ہندوستانی علماء کی خدمات پر مشتمل انسائیکلوپیڈیا "نزھۃ الخواطر" اور "گل رعنا" آپ ہی کی تصنیف ہے، مگر نو سال کی عمر میں ہی آپ کے والد ماجد کا انتقال ہوگیا، چنانچہ آپ کی پرورش وپرداخت کی ذمہ داری آپ کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ پر آگئی، ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ ایک مایۂ ناز عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حکیم وطبیب بھی تھے، جنہوں نے طبابت کی ڈگری لی تھی، لہٰذا آپ عصری اور دینی دونوں تعلیم کا سنگم تھے، دوسری طرف آپ کی والدہ ماجدہ خود بھی انتہائی نیک اور صالح خاتون تھیں اور ساتھ ہی کئی کتابوں کی مصنفہ اور شاعرہ بھی تھیں، ایسے عظیم گھرانے اور دینی ماحول میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم وتربیت ہوئی، بنیادی تعلیم آپ کی والدہ ماجدہ ہی نے آپ کو دی، اس کے بعد مزید تعلیم کے لیے آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، جس کا شمار عالم اسلام کی مشہور اسلامی دینی درسگاہ میں ہوتا ہے۔

۱۳۱ر سال قبل ۱۸۹۲ء میں کانپور شہر میں ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا، جو چھ سال بعد لکھنؤ منتقل ہوگیا، اس کے قیام کا اولین مقصد عصری اور دینی تعلیم کے درمیان امتزاج پیدا کرنا اور ایسے علماء وقائدین تیار کرنا تھا جو قدیم صالح اور جدید نافع کا پیکر ہو اور بلاشبہ حضرت مولاناؒ کی شخصیت اس کا ایک حسین شاہکار تھی، ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۹ء میں گولڈ مڈل کے ساتھ فاضل ادب کی ڈگری حاصل کی، مزید تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند جا کر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے حدیث اور لاہور جا کر حضرت مولانا احمد علیؒ سے تفسیر بھی پڑھی، اس کے علاوہ اپنے وقت کے دیگر علمائے کرام سے استفادہ کیا اور اپنے طالب علمی کے دور ہی میں عربی، انگریزی، فارسی اور اردو زبان میں مہارت پیدا کرلی اور اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تاریخ کا احاطہ کرلیا، ۱۹۳۴ء میں حضرت مولاناؒ کی زندگی میں ایک نیا موڑ اس وقت آیا جب آپ کی محض بیس سال کی عمر میں ندوہ میں استاذ کی حیثیت سے تقرری ہوئی، جہاں آپ تفسیر وحدیث اور ادب عربی کی تعلیم دینے لگے، تقریباً دس سے پندرہ سال تک آپ نے باضابطہ تدریسی خدمات انجام دیں، آپ کی بے پناہ صلاحیتوں وقابلیتوں کو دیکھ کر ندوہ کی انتظامیہ نے ۱۹۵۱ء میں آپ کو نائب معتمد تعلیم بنا دیا، پھر

۱۹۵۴ء میں جب علامہ سید سلیمان ندویؒ کا انتقال ہوگیا تو آپ معتمد تعلیم ہوگئے، پھر ۱۹۶۱ء میں جب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ جو آپ کے بڑے بھائی بھی تھے، کا انتقال ہوگیا تو ان کی جگہ پر ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی نے متفقہ طور پر آپ کو ناظم منتخب کیا، اس کے بعد آپ نے اس گلشن علم و ادب کی آبیاری اپنی آخری سانس تک کی اور اسے شہرت وعظمت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔

جب کسی بھی شخصیت کی عظمت ووقار کا اندازہ لگانا ہو تو اس کے معاصرین کی رائے سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے، آئیے دیکھتے ہیں کہ حضرت مولاناؒ کے معاصرین کیا کہتے ہیں، سعودی عرب کے سابق مفتی شیخ عبدالعزیز بن باز کہتے ہیں کہ: ''شیخ ندویؒ کی کتابوں میں ہم نے ایک نئی زبان اور ایک نئی روح پائی''۔ مشہور عرب ادیب علی طنطاویؒ کہتے ہیں کہ: ''میں نے آپ کو ایک حقیقی عابد وزاہد پایا''۔ شام کے ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی کہتے ہیں کہ: ''ایک ایسا شخص جس کی شخصیت اور قلم کو جانا تو اس کے اندر ایک دھڑکتا ہوا دل پایا''۔ سابق صدر جمہوریہ ہند مسٹر کرشن کانت کہتے ہیں کہ: ''حضرت مولاناؒ نے سارے ہندوستانی پیڑھی کو ایک نئی سمت نئی سوچ دی''۔ سید قطب شہید کہتے ہیں کہ: ''مولانا صحیح نہج کے ساتھ اسلام پر عمل پیرا اور اسلام ہی کے لیے جیتے ہیں''۔ جامع ازہر کے شیخ عبدالحلیم محمود کہتے ہیں کہ: ''حضرت مولاناؒ نے اپنی زندگی اللہ کے لیے وقف کردی تھی''۔

حضرت مولاناؒ کی اردو، عربی، انگریزی، ہندی، درسی وغیر درسی تصنیفات کی تعداد (۳۰۰- تین سو) سے زائد تک پہنچتی ہے، جن میں بیشتر کا ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے، مگر ان میں مشہور درسی کتابیں جو مدارس اسلامیہ اور یونیورسٹیز کے نصاب میں شامل ہیں وہ یہ ہیں قصص النبيين للأطفال ۱-۵، مختارات من أدب العرب ۱-۲، القراءة الراشدة ۱-۳، اس کے علاوہ "روائع اقبال"، "اسمعي يا مصر"، "اسمعي یا ایران"، "اسمعي يا سوريا"، "أحاديث صريحة في أمريكا"، "اذاهبت ريح الايمان"، ''تاریخ دعوت وعزیمت''، ''کاروان زندگی''، ''المرتضیٰ''، ''نبی رحمت''، ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر''، ''دستور حیات'' وغیرہ آپ کی مشہور کتابیں ہیں، مگر جس کتاب نے حضرت مولاناؒ کو عرب ممالک میں پہچان دلائی اور شہرت کی بلندیوں تک پہنچایا وہ "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين" ہے، حضرت مولاناؒ نے یہ کتاب ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان لکھی، اس وقت آپ ایک نوجوان عالم دین تھے، آپ کی عمر محض ۳۰-۳۲ سال تھی، اس کتاب میں حضرت مولاناؒ نے ایک نئی فکر اور ایک نیا نظریہ پیش کیا تھا، سید قطب شہیدؒ اس کتاب کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

''کتاب کا پڑھنے والا بڑی شدت سے محسوس کرتا ہے یہ موجودہ قیادت بدلنے کی سخت ضرورت ہے، مسلمانوں کی قیادت ختم ہو جانے سے پوری انسانیت کو بڑا خسارہ ہوا ہے اور اس خسارے میں مسلمان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا شریک ہے''۔ حضرت مولاناؒ کی اس کتاب نے مسلمانوں کو دنیا کی زمام حکومت اگر سنبھالنے پر ابھارا اور یہ بتایا کہ امت مسلمہ دنیا کی قیادت کے لیے پیدا ہوئی ہے، پہلی بار جب یہ کتاب مصر سے شائع ہوئی تو اس نے عرب کے علمی حلقے میں تہلکہ مچا دیا، بعض ملکوں میں اس پر پابندی بھی لگائی گئی ۱۹۹۵ء میں اس کتاب کی اشاعت کے بعد جب حضرت مولاناؒ نے مصر اور عرب ممالک کا دورہ کیا تو آپ کی شان میں اعزازی جلسے کیے گئے اور جگہ جگہ آپ کا پرتپاک اور پرجوش استقبال کیا گیا، اس کے بعد عرب ممالک میں آپ کی شہرت عام ہوگئی اور عالم اسلام اور یورپ کی مشہور یونیورسٹیوں کے ذمہ داروں نے آپ کو لیکچرز کے لیے بلانا شروع کیا، حضرت مولاناؒ نے دنیا اور عرب ممالک کی تقریباً سبھی مشہور یونیورسٹیوں میں لیکچرز دیئے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، جامعہ قاہر دمشق، جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ، لندن یونیورسٹی، گلاس کو، کولمبیا، کیمرج اور اکسپورٹ وغیرہ میں آپ کے محاضرات بڑے شوق وذوق سے سنے گئے۔

ندوۃ العلماء کے ناظم بننے کے بعد ۱۹۶۱ء سے ۱۹۸۰ء تک حضرت مولاناؒ کی بہت ساری تصنیفات و تالیفات سامنے آگئی تھیں اور اس دوران اپنے دعوتی مشن کی خاطر حضرت مولاناؒ نے بہت سے ممالک کا دورہ کیا تھا، مصر، سعودی عرب، فلسطین، سوڈان، شام، ترکی، برما، بنگلہ دیش، پاکستان، کویت، عمان، اردن، امارات، امریکہ، ایران، افغانستان، مراکش کے علاوہ پیرس، لندن جنیوا وغیرہ کا آپ نے سفر کیا اور وہاں محاضرات دیے، حضرت مولاناؒ کی شخصیت ایک عالمگیر شخصیت بن چکی تھی، دنیا کے کونے کونے میں آپ کی شہرت پہنچ چکی تھی، ۱۹۸۰ء میں آپ کی عظیم الشان خدمات کے اعتراف میں کنگ فیصل ایوارڈ سے آپ کو نوازا گیا، حضرت مولاناؒ نے اس ایوارڈ کی پوری رقم قوم کو عطیہ میں دیدی، ویسے تو حضرت مولاناؒ ہندوستان کی ملت

اسلامیہ کے علمی، عملی اور سماجی وسیاسی خدمات میں روز اول سے مصروف تھے، مگر ۱۹۸۵ء میں جب آپ کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا صدر بنایا گیا اور اس کے بعد شاہ بانو کیس اور یکساں سول کورٹ کا مسئلہ ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے ایک بڑا چیلنج بن کر سامنے آیا تو حضرت مولاناؒ کی ایک آواز پر شیعہ، سنی، اہل حدیث، اور دیوبندی علماء سبھی ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئے، اور حضرت مولاناؒ کی قیادت نے اس وقت کی حکومت کو سپریم کورٹ کے فیصلے کے خلاف بل پاس کرنے پر مجبور کردیا، حضرت مولاناؒ کا نظریہ تھا کہ ایمان کو تخت وتاج اور کرسی تک پہنچایا جائے نہ کہ اہل ایمان کو، حضرت مولاناؒ اپنے دعوتی مشن میں جہاں بادشاہوں اور ملک کے سربراہوں سے ملاقات کرتے، وہیں عوام الناس کو بھی داعی بننے کی بھرپور ترغیب دیتے۔

حضرت مولاناؒ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ آپ مثبت سوچتے، مثبت بولتے اور مثبت لکھتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کے سارے کارہائے نمایاں آج بھی زندہ ہیں، حضرت مولاناؒ بہت سارے علمی اداروں اور یونیورسٹی کی مجلس شوریٰ کے رکن، بہت سے تعلیمی اور سماجی اور ادبی تنظیموں کے مؤسس اور بانی تھے، حضرت مولاناؒ نے ''کل ہند تحریک پیام انسانیت'' کے بانی تھے اور اس کے پلیٹ فارم سے ہندو بھائیوں کو اسلام اور مسلمانوں سے قریب کرنے کی قابل قدر جدوجہد کی، اگر ایک طرف ملت اسلامیہ حضرت مولاناؒ کی شاہ بانو کیس میں بے مثال قیادت کی یاد کرتی ہے تو وہیں مولاناؒ کی دوراندیشی اور دعوت و تبلیغ کے تئیں سنجیدگی کو آج بھی تلاش کرتی ہے، کون نہیں جانتا کہ ہمارے پڑوسی ملک برما سے مسلمانوں کو دربدر کرکے نکال دیا گیا، ان کے نوجوانوں کو قتل، عورتوں کی بے حرمتی اور گھروں کو نذرِ آتش کرکے جانوروں جیسی زندگی گزارنے پر مجبور کردیا گیا، حضرت مولاناؒ نے ۱۹۶۱ء میں برما کے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

''آپ حضرات پورے برما میں پھیل جائیں اور یہاں کے غیر مسلموں کے درمیان اسلام کی دعوت دیں اور اسلام کے متعلق غلط فہمیوں کو دور کریں، ورنہ برما میں آپ کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا'' اور اس دور میں بعینہ وہی ہوا جو حضرت مولاناؒ نے پیشینگوئی کی تھی، اسلامی دنیا کا یہ عظیم محقق، مؤرخ، ادیب، داعی، قائد، مصنف، مفکر اور مصلح، ملت اسلامیہ کا سچا خیرخواہ اور حقیقی خادم ۳۱؍ دسمبر ۱۹۹۹ء کو قرآن پاک کی سورہ یٰسین تلاوت کرتے ہوئے ۸۶؍ برس کی عمر میں اپنے مالکِ حقیقی کے حضور حاضر ہوگیا۔

☆☆☆☆☆

بقیہ صفحہ ۲۴؍کا ....

اور اس کے گناہ میں کوئی کمی نہ ہوگی، پھر آپ نے فرمایا قابیل نے جو قتل کا طریقہ نکالا ہے تو قیامت تک جتنے قتل ہوں گے، سب کا گناہ قابیل کے سر ہوگا''

[ج ۱؍ص ۳۷]

شرک وکفر اور مورتی پوجا، صنم پرستی کی مذمت حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت کے اسباب میں اس طرح بیان کرتی ہیں:

''صورتیں بناتے بناتے، اب پتھر کی مورتیاں بنانے لگے، دیکھتے دیکھتے بزرگوں کی ہم شکل مورتیاں تیار ہوگئیں، اور ان کو اپنے اپنے گھروں اور مسجدوں میں رکھنے لگے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کوئی کمی نہ کی، برابر اس کی عبادت میں لگے رہے، نہ اُس کی عبادت میں کوئی فرق ہوا، نہ اس کا شریک ٹھہرایا، سب سمجھتے تھے کہ یہ پتھر کی مورتیاں تو ان بزرگوں کی تصویریں ہیں، سب جانتے تھے کہ یہ پتھر کی مورتیاں ہیں، نہ کچھ نفع پہونچا سکتی ہیں نہ نقصا، نہ ان سے رزق مل سکتا ہے، نہ یہ کسی کی مددگار ہوسکتی ہیں، ان کو خالی برکت کے لیے اپنے بزرگوں کی یادگار اپنے بزرگوں کی نشانی سمجھ کر اپنے دل کو تسکین دینے کے لیے رکھتے تھے، اور ان کی عزت کرتے تھے، پھر اس کا نتیجہ عیاں کرتی ہیں''۔

[ج ۱؍ص ۵۲]

''اس طرح تصویریں مورتیاں بنیں اور مورتیوں سے معبود بن گئیں، لوگ اللہ کو چھوڑ کر حقیقی معبود کو بھلاکر ان بتوں کی پوجا کرنے لگے، اور اُن کو دنیا مجبور سمجھے گئے، شیطان کا فریب کارگر ہوگیا، وہ اپنے مقصد میں پوری طرح سے کامیاب ہوا، اور لوگوں نے ان معبودوں کے نام رکھتے تھے، کسی کا نام وَدّ تھا، کسی کا سواع، کسی کا یغوث کوئی یعوق تھا کوئی نسر''۔

[ج ۱؍ص ۵۴]

پھر حضرت ہود علیہ السلا کا واقعہ ہے، جس میں قوم عاد کے اعمال اور ان پر پکڑ کا ایسا ذکر ہے کہ ان کے اعمال اور ان کی مشابہت سے دل گھن کرنے لگے۔

حضرت ثمود علیہ السلام کے قصہ میں اونٹنی کے واقعۂ قتل کے انجام کو بڑے نصیحت و سبق آموز انداز ہی دلوں میں برے کاموں سے نفرت پیدا کرتی ہے۔ (جاری)

☆☆☆☆☆

فقہ وفتاویٰ

سوال وجواب

مفتی محمد ظفر عالم ندوی

سوال: ایک شخص نے رہائشی مکان کے علاوہ ایک دوسرا مکان اس مقصد سے خریدا ہے کہ اس سے کرایہ حاصل کیا جائے، اس مکان میں ایک اسکول کرایہ پر چل رہا ہے، کیا اس مکان پر زکوٰۃ واجب ہے؟ اگر زکوٰۃ واجب ہے تو اس کی ادائیگی کس طرح ہوگی؟

جواب: مکان پر اس وقت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جب مکان تجارتی مقصد سے خریدا گیا ہو، لیکن اگر مکان ضرورت سے زیادہ ہو اور تجارتی مقصد نہ ہو بلکہ کرایہ پر لگانا یا کسی اور کام میں استعمال کرنا ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ [ردالمختار: ج۳/ص۱۷۹]

سوال: ایک شخص کے پاس کچھ بسیں ہیں جو کرایہ پر چلتی ہیں، سوال یہ ہے کہ ان بسوں کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہے یا کرایہ پر؟

جواب: بسوں یا ان کی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیونکہ کسب معاش کے جو آلات ہیں ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، فقہاء نے صراحت کی ہے: ''اسی طرح حرفت اور پیشہ کے آلات پر بھی زکوٰۃ نہیں ہے'' [ردالمختار: ج۳/ص۱۸۳]، البتہ ان بسوں سے جو کرایہ حاصل ہوا گر وہ بقدر نصاب ہو اور اس پر سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

[فتاویٰ ہندیہ: ج۱/ص۱۶۷]

سوال: کیا زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے سال گزرنے کی جو شرط لگائی جاتی ہے کیا ہر طرح کے مال میں یہ شرط ہے یا بعض میں، قدرے وضاحت سے بتائیں۔

جواب: زرعی پیداوار اور پھل میں سال گزرنے کی شرط نہیں ہے بلکہ جیسے ہی فصل کٹے اور پھل توڑے جائیں اسی وقت عشر نکالنا واجب ہے، ان کے علاوہ سونے چاندی، نقد رقم اور سامان تجارت وغیرہ میں صاحب نصاب ہونے کے بعد اس مال پر سال گزرنا شرط ہے۔ [فتاویٰ ہندیہ: ج۱/ص۱۷۳]

سوال: ایک شخص نے اپنے گھر کے زیورات رہن پر رکھ دیئے ہیں، دو سال گزر چکے ہیں، کیا ان زیورات پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

جواب: رہن رکھی ہوئی چیزوں پر زکوٰۃ نہیں ہے کیونکہ زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مال زکوٰۃ مکمل طور پر اس کی ملکیت میں ہو، رہن پر رکھی ہوئی چیزیں مکمل طور پر ملکیت نہیں ہوتی ہیں اس لیے اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

[فتح القدیر: ج۲/ص۲۲۱، فتاویٰ ہندیہ: ج۱/ص۱۷۲]

سوال: جو رقم بینک میں فکس ڈپازٹ کے طور پر جمع ہو، کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی؟

جواب: پہلی بات تو یہ ہے کہ فکس ڈپازٹ شرعاً جائز نہیں ہے، تاہم اگر کسی نے رقم بینک میں فکس ڈپازٹ کر دیا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، کیونکہ اس کی حیثیت امانت کی ہوتی ہے اور امانت والی رقم پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ [فتح القدیر: ج۲/ص۲۲۱]

سوال: مالک مکان ودکان کے پاس بطور ضمانت جو رقم پیشگی جمع رہتی ہے کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ اگر زکوٰۃ ہے تو مالک مکان پر یا کرایہ دار پر؟

جواب: مالک مکان یا مالک دوکان کے پاس جو رقم کرایہ دار کی رہتی ہے، اس کی حیثیت رہن کی ہے، اور رہن پر زکوٰۃ واجب نہیں، اس لیے اس کی زکوٰۃ نہ مالک مکان پر ہے اور نہ کرایہ دار پر۔

[دیکھئے: فتح القدیر: ج۱/ص۱۶۴]

سوال: پراویڈنٹ فنڈ کی رقم جو ابھی حاصل نہ ہوئی ہو سرکار یا کمپنی ہی کے قبضہ میں ہو کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہے؟ اور جب رقم مل جائے تو کیا پچھلے سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی؟ رقم ملنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے کیا اس پر سال گزرنا ضروری ہے یا ملتے ہی زکوٰۃ واجب ہوگی؟

جواب: پراویڈنٹ فنڈ کی رقم جو ابھی حاصل نہ ہوئی ہو ملک تام نہ ہونے کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ نہیں ہے، البتہ یہ رقم جب حاصل ہو جائے گی اس کے بعد سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی۔ یہ زکوٰۃ رقم حاصل ہونے کے بعد ہی کے سالوں کی واجب ہوگی، پچھلے سالوں (جبکہ رقم سرکار کے یا کمپنی کی ملک اور قبضہ میں رہی ہو) کی زکوٰۃ نہیں دینی ہوگی)۔

[ردالمختار: ج۳/ص۱۷۱، ۱۷۲]

سوال: جو لوگ اپنے گھروں میں کمپیوٹر، انٹرنیٹ، اور ٹی وی وغیرہ رکھتے ہیں، کیا ان پر زکوٰۃ واجب ہے؟

جواب: کمپیوٹر اور دیگر آلات اگر اپنی ضروریات اور استعمال کے لیے ہیں، تجارت کے لیے نہیں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔

[بدائع الصنائع: ج۲/ص۹۵]

☆☆☆☆☆

NADWATUL-ULAMA
PO. BOX 93, TAGORE MARG, LUCKNOW
226007 U. P. (INDIA)

ندوة العلماء
پوسٹ باکس ۹۳، ٹیگور مارگ، لکھنؤ
۲۲۶۰۰۷ یوپی (ہند)

باسمہ تعالیٰ

Date 10th February 2024

تاریخ ۱۰ر فروری ۲۰۲۴ء

اہلِ خیر حضرات سے

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ حضرت ناظم صاحب ندوۃ العلماء مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی دامت برکاتہم کی سرپرستی میں ندوۃ العلماء اپنی علمی، دینی، تعلیمی وتربیتی خدمات انجام دے رہا ہے، اور ان بیش قیمت اصولوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہے جن کے لیے ندوۃ العلماء کو قائم کیا گیا تھا، یعنی جدید زمانہ میں اسلام کی مؤثر اور صحیح ترجمانی، دین و دنیا کی جامعیت اور علم و روحانیت کے اجتماع کی کوشش، فتنۂ لادینیت اور ذہنی ارتداد کا مقابلہ، اسلام پر اعتماد اور اسلامی علوم کی برتری و امتیاز کا اعلان و اظہار، دین حق سے وفاداری اور شریعت پر استقامت۔

آپ سے ہماری درخواست ہے کہ وقت کی اس ضرورت اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کی افادیت کو سمجھتے ہوئے پوری فراخدلی، فیاضی اور ہمت سے کام لے کر ان تمام کاموں میں بھرپور تعاون و اعانت فرمائیں کہ ہندوستان میں دین کے قلعوں کی حفاظت کی اس سے بہتر کوئی سبیل اور اس سے زیادہ پائدار کوئی صدقہ جاریہ نہیں۔

لہٰذا آپ حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے صدقات و عطیات چیک یا ڈرافٹ کے ذریعہ اور آن لائن ندوۃ العلماء کے مندرجہ ذیل اکاؤنٹ میں منتقل فرمائیں، ایسے نازک اور مشکل حالات میں ندوۃ العلماء کے ساتھ آپ کا تعاون نہایت اہمیت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ان کو ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

(مولانا ڈاکٹر) تقی الدین ندوی	(ڈاکٹر) محمد اسلم صدیقی	(مولانا ڈاکٹر) سعید الرحمٰن اعظمی ندوی	(مولانا) جعفر مسعود حسنی ندوی
معتمد تعلیم ندوۃ العلماء	معتمد مال ندوۃ العلماء	مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء	ناظر عام ندوۃ العلماء

NADWATUL ULAMA

عطیات	A/c No. 1086 3759 711
تعمیرات	A/c No. 1086 3759 733
زکوٰۃ	A/c No. 1086 3759 766

IFSC CODE : SBIN000125 - STATE BANK OF INDIA MAIN BRANCH, LUCKNOW

ONLINE DONATION LINK
https://www.nadwa.in/donation/

نوٹ: چیک/ڈرافٹ پر صرف یہ لکھیں:
NADWATUL ULAMA
اور اس پتہ پر ارسال کریں
NIZAMAT NADWATUL ULAMA
Nizamat Office, Nadwatul Ulama,
Tagore Marg, Lukcnow - 226007 (U.P.)

معطیان کرام! براہ کرم اپنے عطیات ارسال کرنے کے بعد مندرجہ ذیل نمبر
+91-8736833376
پر مطلع فرمانے کی زحمت کریں، اس سے دفتری کارروائی میں سہولت ہوگی۔
فجزاکم اللہ خیر الجزاء

website : www.nadwa.in
Email : nizamat@nadwa.in

نوٹ: ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دیا گیا تعاون سیکشن 80G انکم ٹیکس ایکٹ ۱۹۶۱ء کے تحت انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگا